ترکی جمہوریہ کی نشاۃ الثانیہ کا تجزیہ

ضمیر احمد ہاشمی ایم۔ اے
ڈپٹی کلکٹر صوبجات متحدہ

مطبوعہ جامعہ برقی پریس جامع مسجد دہلی

بار اول ۱۰۰۰ — ۱۹۳۲ء — قیمت [illegible]

اپنے محترم اور محبوب والدین عائشہ محمد عظیم

اور

مولوی محمد عظیم صاحب کی خدمت میں ہدیۂ عجز و نیاز۔

دیباچہ

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد ہندوستانی مسلمان ۔ ترکی کو ہمیشہ نہایت انسیت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں ۔ یہ احساس ابتک برقرار ہے باوجودیکہ ترکوں کے متعلق مختلف النوع شکوک وشبہات کا اظہار وقتاً فوقتاً حال میں ہوتا رہا ہے۔ لیکن یہ احساس عوام کے لیئے بیشتر جذبات پر مبنی ہے اور وہ ترکی اور ترکوں کے متعلق صحیح واقعات سے آگاہ نہیں ۔ چنانچہ اس کتاب کی اشاعت سے یہی مدعا ہے کہ عوام الناس اُس ملک اور وہاں کے باشندوں کے صحیح حالات سے واقف ہو سکیں ۔

تاریخی تالیف وتصنیف کے لیئے اکثر متعدد کتابوں اور اشخاص کا مرہون منت ہونا پڑتا ہے۔ میں نے خود ہر ممکن ذرائع سے صحیح اور درست حالات معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ بالخصوص میں دو اصحاب کا تذکرہ کرنا لازمی سمجھتا ہوں جنکی معاونت میرے لیئے نہایت ہی گرانقدر ثابت ہوئی ۔ پروفیسر اے ۔ جے ۔ ٹوائن بی (لندن

یونیورسٹی) جنھوں نے نہ صرف اپنی کتاب "ماڈرن ٹرکی" مطبوعہ میسرز ارنیسٹ بینٹ کمپنی لندن سے مستفید ہونے کی اجازت دی بلکہ ایک سال تک برابر خط وکتابت کا سلسلہ جاری رکھ کر مجھے بیش بہا مدد دی۔ اور دوسرے میرے برادر محترم بشیر احمد ہاشمی (مسلم یونیورسٹی) جنھوں نے اس کتاب کی تکمیل میں ہر طرح سے میرا ہاتھ بٹایا اور اپنے مشورہ سے برابر میری رہنمائی کی۔

کاتبوں کی شکایت میں محض ایک رسمی شیوہ سمجھا کرتا تھا لیکن تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ذاتِ شریف ہر توصیف سے بالاتر ہیں، چنانچہ اس کتاب میں بھی اُن کی عنایات نمایاں ہیں۔ کتاب کے آخر میں اغلاط نامہ چسپاں کرنا مجھے بعید ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اس لیئے باوجود کتابت کی غلطیوں کے میں اس سے احتراز کرنا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔

عظیم منزل۔ دہلی
۱۲ر نومبر سنہ ۱۹۳۲ء

ضمیر احمد ہاشمی

فہرست مضامین

باب ایک

ترکی دُول مغرب کی نگاہوں میں

باب دو

فتح اور نصرت کا زمانہ از سنہ ۱۳۶۳ء تا سنہ ۱۶۶۴ء

باب تین

مغربیت کا اثر

باب چار

نوجوان ترک و کمیٹی اتحاد و ترقی

باب پانچ

جنگ یورپ کے اختتام پر

باب چھہ

انقلاب کے اولین آثار

باب سات

جنگ ترکی و یونان سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۲۲ء

بین دقیق مراحل۔ (۱) سنہ ۱۹۲۰ء۔ یونانی فتح۔ (۲) سنہ ۱۹۲۱ء۔ یونانی شکست جنگ سقاریہ نے حالات دگرگوں کردیئے۔ (۳) سنہ ۱۹۲۲ء ترکی کی مکمل فتح۔ عارضی صلح۔ تھریس اور ایشیائی ترکی سے یونانیوں کا خروج۔ صفحہ ۱۳۱ تا ۱۵۴

باب آٹھ

اجتماع لوازن اور صلحنامہ

افتتاحی جلسہ نومبر سنہ ۱۹۲۲ء۔ لارڈ کرزن اور عصمت پاشا کی ضد جلسہ کی ناکامیابی۔ دوسرا جلسہ اپریل سنہ ۱۹۲۳ء۔ جملہ ترکی مطالبات کی منظوری۔ قومی تحریک کی کامیابی اور وجوہ۔ صفحہ ۱۵۵ تا ۱۶۷

باب نو

ترکی ذہنیت میں انقلابی کیفیت

قومی جماعت کے مقاصد اور ملکی تحفظ اور تنظیم سلطنت۔ ہر طرف سے رضاکاران کی آمد اور انکی امداد۔ فرانسیسی اثر۔ اجلاس رضی

باب دس

مراعات اور نظامِ ملت کا خاتمہ

باب گیارہ

نہ دار بماند نہ آں داوری

ذاتی کثیر اخراجات ۔ صدر جمہوریت کا انتخاب۔ مصطفےٰ کمال۔
صفحہ ۱۹۵ تا ۲۰۶

باب بارہ

خاتمہ خلافت ۔ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء

سلطان وحید الدین کی فراری اور معزولی ۔ مجلس وطنی کی جانب سے عبد المجید آفندی کا تقرر بحیثیت خلیفہ ۔ خلافت اور مسلمان عالم کا باہمی تعلق ۔ سلطان ترکی بحیثیت مذہبی پیشوا ۔ سولہ ماہ کا تجربہ۔ خلافت سے مجلس وطنی کو خدشہ ۔ خلافت کا خاتمہ صفحہ ۲۰۷ تا ۲۱۰

باب تیرہ

اتحاد اسلامی اور ترکی سلطان بحیثیت خلیفۃ المسلمین

اسلامی معاشرت کے دو اہم اصول ۔ اخوت اور مساوات ، انکی باعث اسلامی ممالک کی معاشرت میں یکسانیت کا ہونا۔ یہ یکسانیت کسی سیاسی مقصد کی وجہ سے نہ تھی ۔ ترکوں نے اس اتحاد سے

فائدہ اٹھانا چاہا - ترکی سلطان تمام عالم کے مسلمانوں کا خلیفہ بھی ہوتا تھا - اس کا سیاسی اثر - عیسائی دول کے خلاف جہاد کی دھمکی دیگر متعلقہ تحریکات اور اُن کے بانی: (۱) عبد الوہاب نجدیہیں - (۲) قاضی سید محمد ابن علی السنوسی - شمالی افریقہ میں (۳) سید جمال الدین افغانی - اوّل دو تحریکات مذہبی تھیں اور تیسری سیاسی - اتحاد اسلامی - جنگ یورپ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء جہاد کی کوشش - اُس کی ناکامی اور وجوہات - تحریک قومی اور حب الوطنی کا جوش - اتحادِ اسلامی سے اس کا تعلق - موتمر اور اتحاد اسلامی کا مستقبل - صفحہ ۲۱۹ تا ۲۴۰

باب چودہ

ترکی جمہوریت اور اسکا مختار مطلق

آئینی حکومت اور عوام الناس کی بیداری - جمہوریت میں صدر کی مطلق العنانی - اسکی متعدد امثال درویشوں کی بغاوت اور اُنکی سزا - لطیفہ خانم سے نکاح اور طلاق - جمہوریت اور

باب پندرہ

اندرونی ترقی

باب سولہ

تمدن اور معاشرت

۱۲

سے انتظام اور مراعات۔ خواتین کی بیداری۔ مذہب اور سیاست۔ تمدن اور معاشرتی تبدل۔ صفحہ ۲۸۳ تا ۳۰۸

باب ایک

۴

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

باب ایک

ترکی دول مغرب کی نگاہوں میں

تہذیب مغرب کے معرکہ آرا اثرات سے کون انکار کرسکتا ہے۔ دنیا کے چپے چپے میں اس کے کرشمے نظر آرہے ہیں، عراق وعرب، ترکستان وایران۔ افغانستان وہندوستان، چین اور جاپان۔ امریکہ اور افریقہ کون سا مقام ہے کہ جہاں اس کی سحر کاریاں عیاں نہیں۔ لیکن یہ سحر کاریاں بہ اندازہ جلب منفعت مختلف النوع ہیں۔ کسی ملک کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا دیا جاتا ہے۔ کسی کو تھپک تھپک کر سلا دیا جاتا ہے۔ اور کسی بدنصیب کو یہ کہکر مایوس کر دیا جاتا ہے کہ نہ اب تمہارے جاگنے کی ضرورت ہے اور نہ سونے سے فائدہ اس لئے تمہیں دنیا سے نیست ونابود کر دینا ہی تمہارے لئے مفید ہے

مگر جان پڑی ہے۔ شدید سے شدید مرض میں مبتلا مریض بھی اپنی موت کے مشورے کو پسند نہیں کرتا۔ اور تن بہ تقدیر ہو کر چارہ ساز کو یہ کہہ بیٹھتا ہے کہ میرا مرض تمہارے بس کا نہیں ہے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اور تم رخصت ہو جاؤ۔ عموماً ایسی حالت میں معالج رخصت ہو جاتے ہیں۔

لیکن مہذب یورپ اپنے مریض سے کہتا ہے کہ نادان تجھے اپنے بھلے بُرے کی تمیز نہیں رہی۔ میری موجودگی ضروری ہے۔ اب امید افاقہ موہوم ہے۔ اور موت یقینی ہے۔ تیری موت کے بعد تیری دولت کی تقسیم کے وقت فساد کا ڈر ہے۔ میری موجودگی صلح و آشتی کی ضامن ہے۔ اس لئے میں تیری زندگی کے آخری لمحات تک ضرور موجود رہوں گا۔ بیشتر مریضوں نے یہ سنکر خاموشی اختیار کرلی اور اپنے چارہ ساز کے قدموں ہی میں جان دیدی لیکن کوئی آٹھ دس برس کا ذکر ہے کہ ایک سخت جان بستر مرگ سے چاق چوبند ہو کر اٹھ بیٹھا اور نہ صرف مرض ہی سے شفا پا گیا بلکہ اپنے معالج اور چارہ ساز کے طریقہ علاج اور مجرب نسخوں

سے بھی واقف ہو گیا۔ اور کچھ عجب نہیں کہ اس نے حاصل کئے ہوئے علم کے زور پر خود بھی علاج شروع کر دے۔

تخیل کی دنیا سے عالم واقعیت میں آیئے۔ تو آپ کو علم ہو جائے گا۔ کہ یہ انوکھا مریض "ترکی" تھی۔ اور اس کے معالج و چارہ ساز دول یورپ۔

ایک طویل اور مسلسل کشاکش حیات کے دوران میں ترک نے مینائے فرنگ سے بہتر خواب آور مگر چند روح پرور بادہ چکھے اور اپنی دیرینہ توبہ کو توڑ بیٹھا۔ ترک کی "فکر نوزادہ نے شیوہ تدبیر" پیر فرنگ سے سیکھ لیا۔ اور اس کی چشم ملت کھل گئی۔ حتیٰ کہ ۲۹ ر اکتوبر ۱۹۲۳ء انگورہ کی مجلس وطنی نے ایک قرار داد کی رو سے جمہوریت ترکی کی بنا ڈال دی۔

ساقیا تنگ دل از شورش مستانہ نشوی
خود تو انصاف بدہ ایں ہمہ ہنگامہ کہ کیست؟

اب موجودہ ترکی کو دیکھئے۔ ۲۰ ر اپریل ۱۹۲۴ء میں ایک نظام جمہوریت معرض وجود میں آگیا تھا۔ اسے ترکی مدبروں نے ۱۹۲۵ء

ہیں اناطولیہ میں قائم ہونے والی ترکی جمہوریت کے لیے منظور کر لیا اور یہ اعلان کر دیا کہ ہمیں اپنی شخصیت قائم رکھنے کے لیے یورپ کی قومی سلطنتوں کی طرح اپنی بھی تنظیم کرنی پڑے گی۔ اس فیصلے کا اثر یہ ہوا کہ آج ہر شعبہ حیاتِ شخصی و ملی میں ہم یورپ کا اثر موجود پاتے ہیں۔ اسوقت یہ تنقید مقصود نہیں کہ یورپ کی کورانہ تقلید احسن ہے یا قبیح۔ یہاں صرف اظہار امر واقعہ منظور ہے۔ مثلاً ترکی زندگی کے چند شعبوں کو لیجیے۔ اور دیکھیے کہ کیا کیا انتظامات اور تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔

ترک سپاہی کی بہادری کا دنیا اعتراف کرتی ہے۔ اور اس امر سے بھی کسی کو انکار نہیں کہ ہر ترک فطرتاً سپاہی ہے۔ لیکن تنظیم جدید سے قبل ترکی عساکر کی حالت کچھ زیادہ قابل اطمینان نہ تھی۔ دورِ حاضرہ میں اربابِ حل و عقد نے یہ محسوس کر لیا کہ قرونِ وسطیٰ کے آلات حرب اب مفید کار نہیں۔ اور اگر ترکی زندہ رہنا چاہتی ہے تو اس کے عساکر کی تنظیم مغربی نہج پر نہایت ضروری ہے۔ آج ہم اسی خیال کا عملی ظہور ترکی افواج کی تنظیم۔ نئے سے نئے فوجی انکشافات سے

بہرہ اندوزی میں پاتے ہیں۔ ترکی افواج کے پاس تمام وہ ذرائع
اور اسباب موجود ہیں جو یورپ کے عمدہ اور کامیاب افواج کی
کامیابی اور جبروت کا باعث ہیں۔

ترکی بیشتر زراعتی ملک ہے۔ اور اسوقت تک جبکہ مصنوعات
ملکی خوب ترقی نہ پا جائیں۔ ترکی کے لئے زراعت ایک ضروری
ذریعہ حیات رہے گا۔ لیکن ترکی کے طریقہ زراعت اسقدر پارینہ
تھے کہ آج ان کی حیثیت کوہ کندن وکاہ برآوردن سے زیادہ نہیں
ترکی ملت نے ان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اور یہ اطمینان بخش واقعہ
ہے کہ آج ترکی کاشتکار زراعت کے نوایجادہ آلات کی مدد سے
اپنی محنت کا پھل اپنے آبا واجداد سے زیادہ اٹھا رہا ہے یہ اور
اسی قسم کے بے شمار نئے وغیرہ۔ ترکی کی زندگی کا جزو بنتے چلے جاتے
ہیں لیکن ان سب سے زیادہ اہم ترکوں کا احساس قومیت ہے کہ جو
ان جملہ انتظامات کا متحرک ہے۔ قومی سلطنت کا ظہور پذیر ہونا ہی
اس احساس قومیت کی کافی دلیل ہے۔ لیکن ذرا غائر نگاہ سے دیکھئے
تو معلوم ہو جائے گا کہ جمہوریہ ترکی ہر چند کہ اپنی آئینی کیفیت میں فرانس

کی موجودہ طرز حکومت سے مشابہ ہے لیکن اپنی سماجی کیفیت میں مختلف ہے یعنی وہ اساس زندگی جو فرانس میں چند صدیوں سے چلا آرہا ہے یہاں موجود نہیں۔ اور اسی لئے اب کوشش کی جارہی ہے کہ جلد از جلد جس حد تک ممکن ہوسکے ترکی کی سماجی کیفیت میں بھی تبدیلیاں ہو جانی چاہئیں+ ترکی انقلاب میں سب سے زیادہ تحیر خیز ترکی خواتین کی یک بیک بیداری ہے+ اس نئی زندگی کے مدد و معاون اسباب کی ایک طویل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔ از اں جملہ ایک سب سے مشہور امریکن تعلیم گاہ جو ایک مدت سے استانبول میں موجود تھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس تعلیم گاہ کے اثرات اب صفحہ شہود پر آرہے ہیں۔ ترکوں کی فراست کی داد دیجئے۔ کہ انھوں نے تمام غیر اقوام کی قائم کردہ تعلیم گاہوں کو تباہی سے بچا رکھا ہے۔ اور ان سے جس قدر فائدہ اٹھانا ممکن ہے اٹھا رہے ہیں+

آج اس بات کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ متواتر تبدیلیاں کس حد تک "خذ ما صفا" ہیں۔ اور کس درجہ "دع ما کدر" لیکن اس بات سے انکار کرنا ممکن نہیں کہ یہ سب تقلید یورپ کا نتیجہ ہیں۔ آئندہ صفحات

میں کوشش کی گئی ہے کہ ترکوں کی موجودہ زندگی کا تجزیہ مختلف نقطہ
نگاہ سے کیا جائے ۔

آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے متجسس اور دقت پسند نگاہیں اس دور کی دھندلی سی تصاویر بھی نہ دیکھ سکتی تھیں ۱۷۷۴ء میں دولت عثمانیہ نے جب ایک خطرناک روسی جنگ سے نجات حاصل کی تھی۔ اس وقت بھی مغربی رنگ کی جھلک ترکی زندگی میں نظر نہ آتی تھی۔ دیرینہ رسوم وقیود پر ترکی زندگی کا انحصار تھا۔ اور رسوم ورواج بھی کیسے کہ جو اہل یورپ کی زندگی سے نہ صرف مختلف تھے۔ بلکہ متنازعہ۔ اس مرتبہ پہلی بار ترکوں کو تقلید یورپ کا خیال ہوا اور ایک ناتواں سی لہر ان کی زندگی کے بحر الکاہل میں دوڑ گئی۔ ۱۷۷۴ء سے لیکر ابتدائی جنگ یورپ تک اور پھر ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک کے واقعات کے مطالعہ سے صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس دوران میں ترکی نے دول یورپ کے دوش بدوش چلنے کے لئے کیا کیا کوششیں کیں۔ مغربی زندگی اور خیالات کا ترکی زندگی اور خیالات سے کیونکر تصادم ہوا۔ اور اس سے زیادہ کون سے نتائج

نکلتے رہے۔ کہ جو حقیقتاً لوزان کانفرنس ۱۹۲۳ء کے بعد ترکی کی نشاۃ الثانیہ کے ذمہ دار ہیں۔ مگر مدبران یورپ کی کوتاہ نظری دیکھئے۔ کہ وہ ۱۸۷۴ء ہی میں یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ترکی سلطنت کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ اور ترکی تمام ہو چکی۔ اور اب بھی باوجودیکہ ترکی وہ ترکی نہیں رہی بیشتر مغربی اقوام ترکی حالات سے کوئی صحیح واقفیت نہیں رکھتیں۔ اس لیئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس روش نظر پر بھی غور کیا جائے کہ جس سے یورپ کی مختلف سلطنتیں ترکی کو ڈیڑھ سو سال تک دیکھتی رہیں +

یورپ کے کسی باخبر باشندے سے پوچھئے کہ ترکی کیا ہے؟ وہ یہی کہے گا کہ ترکی روئے زمین پر ایک ملک ہے کہ جہاں حضر عیاش مزاج پاشا آباد ہیں اور ہر شخص کے پاس حرم ہے کہ جس کی حفاظت کے لیئے اس کے مکان کے چاروں طرف ایک بڑی اور بلند چہار دیواری ہے + وہاں کے قالین مشہور ہیں + وہاں سے عمدہ تنباکو اور سمرنا کی انجیریں دستیاب ہوتی ہیں + یا تجارتی نقطۂ نگاہ سے یورپ کی مصنوعات کے لیئے ایک بڑی منڈی ہے +

اس کے دل میں یہ خیال کبھی نہ آئے گا کہ ترکی بھی ایک ایسا ملک ہے
جہاں خدا کی مخلوق بستی ہے۔ اور جہاں کے افراد کشمکش حیات اور ننگاہ
آز سے بچے رہنے کے لئے یورپین آبادی سے زیادہ دست و گریباں
رہتے ہیں + اور جو بدقسمتی سے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے
دنیا کی متمدن اقوام کی نگاہوں میں مناسب ترین لوگ تصور کئے
جاتے ہیں + کسی یورپین مدبر سے ترکی کے متعلق پوچھئے۔ تو اسے
سوائے ترکی کے محل وقوع اور جغرافی کیفیت کے کوئی اور بات
قابل اعتنا نظر نہیں آئے گی + بغداد ریلوے۔ درہ دانیال۔ آبنائے
باسفورس۔ ہندوستان کا خشکی کا راستہ اور چند سیاسی مسائل کا مجموعہ
اس کے معہود ذہنی میں ترکی ہے۔ الغرض سیاسی۔ اقتصادی اور
تجارتی حیثیت کے علاوہ ترکی کی کوئی اور حیثیت ہے ہی نہیں + وہ
صرف ایسا خطہ زمین ہے کہ جس کے حصول کی ہر ایک کو فکر ہے۔ اور
جو ہر وقت غربی اقوام میں جنگ و جدل کا باعث ہو سکتی ہے +
اہل یورپ ترکی کو اپنے فائدہ یا نقصان کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور
یہ خیال تک بھی نہیں کرتے کہ بذات خود ترک بھی ایک قوم ہے اور

ایک ملک پر حکمراں + اور اس قابل نہیں کہ فراموش کیے جا سکیں +
اس کثیر التعداد طبقے کے وجود کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایک
مخصوص جماعت۔ ان متعصبانہ خیالات کی تردید پر تیار ہو گئی ہے اور
ترکوں کی جا و بیجا حمایت و تعریف کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے + نیز
ان کو تمام ایسے اوصاف سے متصف کر دیتی ہے کہ جس سے
عموماً یورپین مبرّا نظر آتے ہیں۔ غرض کہ موافقین اور مخالفین افراط
اور تفریط پر تُلے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں جبکہ کسی قوم کی حیثیت
کا اندازہ صرف جذبات کی بنا پر۔ نہ کہ واقعات کو مدنظر رکھکر کیا جائے۔
صحیح محاسبہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے + ان وجوہات کے باعث یہ بات
تعجب خیز نہیں کہ ترکوں کی حالت کا اندازہ متانت سے نہیں کیا گیا
اور ان کے متعلق یورپ کے ممالک میں غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے +
یہی وجہ ہے کہ ترکی کے مستقبل کے متعلق مدبّران یورپ کی
پیش گوئیاں ہمیشہ غلط ثابت ہوتی رہی ہیں۔ ترکی میں تہذیب
مغرب کے اثرات کم و بیش پچھلے ڈیڑھ سو سال سے رونما ہوئے
ہیں۔ اور یہ اس قدر ماضی قریب کے واقعات ہیں کہ صاف طور

پر ان کی اہمیت نظر نہیں آتی + چونکہ اہل یورپ ایک غلط فہمی میں مبتلا
ہیں۔ اس لیئے وہ ان اثرات کی حقیقت سے اور بھی ناآشنا رہتے
ہیں + کس قدر مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے کہ ترکی میں انقلابی حالت
کی وجہ تہذیب مغرب کے اثرات ہیں لیکن اہل یورپ خود اب
تک سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ ان کی تہذیب کی کامیابی کی بین دلیل
ہے۔ نہ کہ ترکی معاشرت کی ابتری۔ جدید ترکی کی تاریخ کا سب سے
اہم واقعہ یہ ہے کہ باوجود ایسی معاشرت اور ایک قدیم تمدن کے
جو یورپ کی معاشرت اور تمدن سے بالکل جدا گانہ تھا ترک ہمیشہ
اس میں کوشاں رہے۔ کہ وہ تہذیب یورپ کی جس قدر جلد ممکن ہو سکے
تقلید کریں + اہل یورپ نے ہمیشہ اس واقعہ کو سمجھنے میں غلطی کی اور
ترکوں کے مطمح نظر تک پہونچنے سے ہمیشہ قاصر رہے +

اہل یورپ اور ترکوں میں تمدنی اور معاشرتی اختلاف عیاں
ہے + ماحول۔ ایک قوم کے تمدن اور معاشرت کے ڈھلنے میں
بڑا اثر رکھتا ہے + لیکن اس کلیہ کو اکثر اہل یورپ نظر انداز کر کے
ترکی تمدن کے اختلاف کو ترکی ہی کا قصور سمجھتے رہے۔ اور اس

اختلاف طرفی کو تعصبات کے باعث شدید حقارت سے دیکھتے رہے گویا یہ اختلاف ترکی کا ایک ایسا گناہ تھا جس کا کوئی کفارہ تھا نہ تلافی + ترکوں کی ہر اصلاحی کوشش کو یورپ کے نکتہ سنج۔ مریض کا سنبھالا ہی سمجھتے رہے۔ اور ترکوں کی ہر کامیابی کو ایک بجھ جانے والی شمع کے فروغ سحری سے زیادہ وقعت نہ دی۔ رفرجیات سی اپنی بیگانگی کو مرض الموت قرار دیکر ترکی کو "یورپ کے مریض آدمی" کے لقب سے ملقب کرتے رہے۔ اس لقب "یورپ کے مریض آدمی" کی وجہ تسمیہ قابل ملاحظہ ہے ۱۴۵۳ء سے ۱۶۸۳ء تک یورپ کو گناہ گار تصور کیا جاتا تھا۔ اور ترکی کو ایک "قہر الٰہی" جس کو خدا نے تادیب یورپ کے لئے مقرر کیا تھا + یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ترکوں کے عساکر کے سامنے یورپ کی بڑی سے بڑی اور طاقتور سی طاقتور فوج بھی مقابلہ میں نہ آسکتی تھی لیکن رفتہ رفتہ وہ طاقت زائل ہوگئی اور یہ نوبت پہونچی کہ زار نکولس اول نے ۱۸۵۳ء میں سفیر برطانیہ سے دوران گفتگو میں ترکی کو ان الفاظ سے ملقب کیا ہے کہ "ہمارا واسطہ ایک مریض سے پڑا ہے جس کی حالت بہت خطرناک ہی اور ممکن ہی

وہ ہمارے ہاتھوں ہی میں دفعتاً جان دیدے؛ اس دن سے ترکی کو "ایک مریض شخص" سے تعبیر کیا جاتا رہا + اور اس کی ہمسایہ قومیں اس کی موت کا متواتر انتظار کرتی رہیں + ان میں سے چند امید افزا بیقراری سے اور چند غیر اطمینانی اضطرار سے + لیکن ہر قوم یہ قوی امید لئے ہوئے تھی کہ یہ ناگزیر حادثہ ضرور جلد از جلد پیش آ جائے گا + ۱۸۷۶ء میں ترکی کا آخری وقت تصور کر لیا گیا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں کم و بیش اس کی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ اور ۱۹۱۴ء میں تو شبہہ ہی نہ تھا۔ کہ ترکی صفحہ ہستی سے معدوم ہوا ہی چاہتی ہے + لیکن شاید بہ مصداق ع "اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد" ترکی میں نئی قوتیں موجزن ہوئیں اور اسی مریض نے پھر اپنے طاقتور رقابتین کو لوزان کانفرنس میں شکست دی + یہ سب کچھ ہوا لیکن طفلانہ تمناؤں کا یہ حال ہے کہ اس مفروضہ بیمار کے لئے اب بھی کسی ایسی اندرونی بیماری کا انتظار کیا جا رہا ہے جو دیر یا زود ترکی کو عاجز کر دے گی + کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ترک نہایت شرمناک بیماریوں کے باعث ہلاک ہو جائیں گے۔ اور کبھی یہ کہ اُن کا خاتمہ اقتصادی افلاس

کی بنا پر ہوگا + حتیٰ کہ وہ اپنے لئے ضروری اشیاء بھی بہم نہ پہنچا سکیں گے + اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ بے بنیاد خیالات کہاں تک جذبات پر مبنی ہیں۔ اور کس درجہ واقعات پر + "چاہ کن را چاہ درپیش" کی زندہ تصویر ہماری نگاہوں کے سامنے ہے + زار نکولس اول نے ۱۸۵۳ء میں ترکی کو جانکنی کی حالت میں تصور کیا تھا + لیکن ستر سال بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ زار کی وسیع سلطنت تباہ ہوگئی۔ اور وہ "مریض ترکی" اپنے بستر مرگ سے اٹھ کر قسطنطنیہ سے انگورا جا پہونچا + اور اب بظاہر توانا نظر آتا ہے + اہل یورپ کے لئے ترکوں کی حالت ایک ایسا معمہ ہے کہ جس کے حل کرنے سے وہ مجبور رہیں + ان کو سب سے زیادہ حیرت اس وقت ہوتی ہے کہ جب ترک ان کی توقعات کے خلاف بجائے معدوم ہو جانے کے ایک نئے جوش کے ساتھ زندگی شروع کر دیتے ہیں +

عموماً ایک یورپین کو ایسے مواقع کم میسر آتے ہیں لیکن جب اس کو کسی ترک سے انفرادی حیثیت سے ملاقات کا موقع دستیاب

ہوتا ہے۔ تو اس کے حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہیں رہتی +
اہل مغرب کے نزدیک ایک ترک کی شخصیت کا مفہوم ایک ایسا
انسان ہے جو ایک قسم کی تورانی زبان بولتا ہے جس میں صیغوں کی
بہتات سے زبان اُلجھ کر رہ جاتی ہے۔ اور جو دیگر مغربی زبانوں
سے بہت مختلف اور مشکل ہے۔ مزید براں جس کی طرز تحریر داہنی
طرف سے بائیں طرف کو عربی حروف میں ہے اور اس لحاظ سے
بھی اُن کی طریقہ تحریر سے جو لاطینی حروف میں بائیں جانب سے
شروع ہوتی ہے۔ مختلف ہے + ان اختلافات کے علاوہ ترک
کا مذہب بجائے عیسائیت کے اسلام ہے + الغرض ان خیالات
کی بنا پر وہ مہذب یورپین ایک پیکر تراش لیتا ہے کہ ترک ایک
وحشی قوی ہیکل شخص ہوگا جس کی چپٹی ناک اور چھوٹی چھوٹی گول
گول منگولی آنکھیں۔ اس کے چہرے کو اور بھی بھیانک بنا دیتی
ہوں گی۔ وہ غالباً ایک دیو پیکر گھوڑے پر سوار ہوگا۔ اسکے
ہاتھ میں ایک ایسی سفاک تلوار ہوگی کہ جس کے قطع برید سے حیات
موجودہ تو کیا بلکہ روئیدگی آئندہ بھی معدوم ہو جائے۔ یا اگر یہ نہیں

تو یورپین نگاہ تخیل میں ترک ایک موٹا تازہ آدمی ہے جو ڈھیلے
ڈھیلے کپڑے لمبا چغہ اور پیچ در پیچ دستار باندھے ہوئے ہے
جس کی لانبی داڑھی اس کی شکل کو اور بھی بھیانک بنا دیتی ہے۔
اور جس کے پیچھے کچھ فاصلے سے برقعہ پوش خواتین کا ایک جھرمٹ
نہایت مودبانہ ہمرکاب ہے۔ اور یہ سب خواتین اس کی حرم ہیں+
لیکن اہل مغرب کو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ تورانی
زبانیں ان کے قریبی عزیز بھی بولتے ہیں۔ مثلاً باشندگان ہنگریا۔ وفن لینڈ
اور یہ کہ عربی طرز تحریر ایک قدیمی اور کارآمد مختصر نویسی کا طریقہ ہے۔
اور یہ بھی کہ اعتقادات مذہب کی رو سے اسلام۔ عیسائیت کے
"توحیدی فرقہ" کے اصولوں کا پیشرو ہے۔ اور کئی دیگر مذہبی اصول
میں بھی عیسائیت سے مشابہ ہے+ یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ متحیر
ہو جاتے ہیں کہ جب ترک ایک گورے چٹے سفید رنگ کا آدمی نظر
آتا ہے۔ جو اپنے مغربی لباس سے اس قدر مانوس معلوم ہوتا ہے کہ
جیسے وہ اس کو معمولاً پہنتا ہو۔ اور فرانسیسی زبان اس قدر روانی سے
بولتا ہے کہ بیشتر اہل انگلستان اور اہل امریکہ انگشت بدندان رہ جاتے

غرضکہ اس میں اور کوہ ایلپائن سے گذر کر جو یورپ کے باشندے ہیں ان میں بلحاظ قد و قامت و نقش و نگار و شکل و شباہت سر مو فرق نہیں۔ یقیناً اکثر لوگوں نے مصطفےٰ کمال کی تصویریں دیکھی ہوں گی اور تعجب کرتے ہوں گے کہ کیا واقعی تمام ترک جسمانی طور پر اپنے صدر جمہوریت سے اسدرجہ مشابہت رکھتے ہیں + لیکن اس میں شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ تمام ترک اسی سانچہ میں ڈھلے نظر آتے ہیں + ہرچند کہ اناطولیہ کے اندرونی حصہ میں ایسے لوگ کم ہیں لیکن بقیہ سب ترکوں کا یہی حال ہے + بہرحال اگر سمرنا سے قرہ حصار تک سفر کریں تو جو قومی اختلافات نظر آتے ہیں وہ کسی طرح ان قومی خصوصیات سے مختلف نہیں کہ جو یورپ سے یورپ جانے تک محسوس ہوتی ہیں جتنا ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل سے اندرونی حصوں میں مشرق کی طرف جائیں۔ اسی قدر سفید رنگ کے افراد زیادہ تعداد میں ملتے جائینگے۔ اور اگر محض اسی معیار کو پیش نظر رکھیں تو ایسا معلوم ہوگا کہ بجائے وسط ایشیا سے شمالی یورپ کی طرف جا رہے ہیں +

ان ترکوں کے متعلق جو ارکین دولت عثمانیہ کی نسل سے ہیں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں قومی خصوصیات اس وجہ سے ہیں کہ وسط یورپ روس اور کوہ قاف سے کنیزیں منگانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا کہ جس کے باعث امتزاج خصوصیاتِ جسمانی ممکن ہوگیا + مگر موجودہ ترکوں میں سے تو بیشتر اناطولیہ کے قدیم باشندوں کی نسل سے ہیں۔ جو ترک ہونے سے قبل بازنطینی وغیرہ کے نام سے مشہور رہے ہیں + اور ہمارے سامنے کوئی ایسی شہادت موجود نہیں جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ ترکوں کے آباواجداد موجودہ مخلوط النسل باشندوں سے اپنی جسمانی ساخت و شکل و شباہت کے لحاظ سے چنداں مختلف تھے + ترکوں کی موجودہ نسل یقیناً "سفید رنگ آدمیوں" میں شامل ہے + لیکن آج کل ایک عجیب خیال عام طور پر رائج ہے کہ صرف عام مغربی اقوام "سفید رنگ آدمیوں" میں شامل ہیں۔ اور یہ کہ "سفید رنگ آدمی" اور "مغربی اقوام" دو مترادف کلمات ہیں + یعنی جو لوگ "سفید رنگ ہیں" وہ کلیتہً مغربی اقوام کی نسل ہیں + اس خیال کی حقیقت اظہر من الشمس ہے + شمالی افریقہ میکسیکو اور برازیل

ہیں بے شمار تعداد ایسے "کالے آدمیوں" کی ہے جن کی طرز معاشرت بالکل مغربی ہے + برخلاف اس کے ایشیا میں ایسی متعدد اقوام ہیں جو باوجود "سفید رنگ" ہونے کے بالکل وحشی نظر آتے ہیں ؛- مثلاً ریف ۔ کُرد ۔ باشندگان سرحد شمال ومغرب ہندوستان اور شمالی جاپان کے اینو + علاوہ ازیں ایسی قومیں بھی ہیں جو مغربی النسل نہیں لیکن مہذب شمار کی جاتی ہیں ۔ مثلاً روسی وایرانی + پھر ایسی قومیں بھی ہیں جو سفید رنگ کے مہذب آدمی ہیں لیکن ایک طرز معاشرت کو ترک کر کے دوسری اختیار کر رہے ہیں + مثلاً خود ترک + ترکوں کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ ہرچند وہ خود "سفید رنگ" آدمیوں کے زمرہ میں شامل ہیں تاہم اُن کو "کالے آدمیوں" سے وہ نفرت نہیں جو دیگر اقوام کو ۔ اور خاصکر انگریزی بولنے والی قوموں کو ہے + چنانچہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں کہ اکثر ترک سپاہی ایک کالے فوجی افسر کے ماتحت کام کرتے نظر آتے ہیں + اس نمایاں خصوصیت کی اصل وجہ "اسلامی اخوت" کی پابندی ہے + لیکن اب اندیشہ ہے کہ کہیں مغربی تہذیب کی پیروی سے یہ امتیاز جاتا نہ رہے ۔

اگرچہ ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو۔ کیونکہ ترک مغربیت کو زیادہ تر فرانسیسی طرز پر اختیار کر رہے ہیں نہ کہ امریکن طرز پر۔ مذکورہ بالا واقعات اور حالات سے یہ ظاہر ہے کہ ترکوں اور ترکی کے متعلق اہل مغرب کس قدر غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ بیشتر افراد ترکی پر دور ہی سے ایک نگاہ غلط ڈال کر رائے قائم کر لیتے ہیں۔ اس غلط نگاہی کا لازمی نتیجہ تھا کہ ان کے لئے ترکی و ترک ایک فوق الادراک معمّہ بن گئے۔

میری کوشش اس کتاب میں یہ ہو گی۔ کہ ترکی کو ترکوں ہی کے نقطہ نظر سے دیکھیں۔ اس طرح نہ صرف ہم ترکی ہی کے متعلق صحیح اندازہ لگانے میں کامیاب ہو سکیں گے بلکہ تہذیب مغرب کو اسکے نئے ماحول میں پرورش پاتے ہوئے بھی دیکھ سکیں گے۔ اور یہ امر بھی واضح تر ہو جائے گا کہ اگرچہ ترکی پر ایک حد تک "مریض شخص" کی مثال صادق آتی تھی لیکن اس کا عارضہ کبھی مرض الموت قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اور اس تشخیص مرض میں زار نکولس نے فاش غلطی کی تھی۔ کیونکہ اس کو علامات کے سمجھنے

میں صریحاً ہو کہ ہوا+ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ جیسے ایک
شخص کا پاؤں جسکو علم حیوانات سے کچھ واقفیت نہ ہو۔ دفعتاً ایک
ایسے سانپ پر جا پڑے جو کینچلی اُتار رہا ہو۔ وہ فوراً باور کر لیگا کہ
سانپ اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہا ہے اور اب کسی
طرح جانبر نہ ہو سکے گا+ کیونکہ اس کے ذہن میں بس یہی آ سکتا
ہے کہ اگر کسی شخص کی کھال اوتار دیجاوے تو وہ کسی طرح زندہ
نہیں رہ سکتا۔ لیکن ہرچند کہ یہ درست ہے کہ گلدار چیتے کے گل
اور حبشی کا سیاہ رنگ بدلا نہیں جا سکتا لیکن یہ بھی تحقیقات سے
ثابت ہو چکا ہے کہ سانپ کو یہ دونوں باتیں معمولاً پیش آتی ہیں+
سانپ پر بھی یہ حالت شاق گذرتی ہے۔ اور اس نیم مُردگی کی
حالت میں وہ اپنے غنیم کے لئے صید زبوں ہوتا ہے لیکن جب
وہ اس حالت سے گذر جاتا ہے۔ تو ایک حیات تازہ حاصل کر لیتا
ہے۔ ترکی کی حالت بھی بجنسہ یہی تھی اور اس لئے بہ نسبت ایک
مریض شخص کے ایک کینچلی بدلنے والے سانپ کی مثال ترکی پر زیادہ
صادق آتی ہے۔ اس کتاب میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ ترکوں

اس کی نئی گنجلی میں پیش کیا جائے مگر اس فیا ئے تو کا صحیح
اندازہ لگانے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ترکی کے
دور گذشتہ پر بھی نگاہ ڈالی جائے۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال کے
تغیرات کا اجمالی محاسبہ کیا جائے۔

باب دو

فتح اور نصرت کا زمانہ از سنہ ۱۳۰۰ء تا سنہ ۱۶۸۳ء

تیرہویں صدی کے آخر میں تاتاری مغلوں کی چیرہ دستی اور تاخت و تاراج سے تنگ آکر وسط ایشیا کے خانہ بدوشوں نے جن کی تمام کائنات ان کے مویشی ہوتے تھے۔ مغرب کا رخ کیا اور سطح مرتفع اناطولیہ کے شمالی مغربی حصہ پر جاکر آباد ہو گئے + یہاں اسلامی اذان اور تکبیروں کی آوازوں سے اُن کے کان پہلی مرتبہ آشنا اور لذت گیر ہوئے + اور اس درجہ کہ تکبیر کی آواز سنکر ان خانہ بدوشوں نے قبلہ رو ہوکر اپنے سر تسلیم خم کر دیئے۔ اس طرح دولت عثمانیہ کی دو نمایاں خصوصیات تھیں ایک ان کی معاشرت جو وہ اپنے ہمراہ وسط ایشیا سے لائے تھے۔ اور جس سے یورپ بالکل ناآشنا تھا۔ دوسرا اُن کا مذہب جو اُنہوں نے اناطولیہ میں آکر اختیار کیا تھا اور

جس سے اہل یورپ کو محض اتنی ہی واقفیت تھی کہ اس کو اپنے مذہب یعنی عیسائیت کا حریف اور دشمن سمجھتے تھے۔ وہ خاص معاشرت جو ان خانہ بدوشوں کے ساتھ وسط ایشیا سے آئی تھی یورپ پر کچھ اثر نہ ڈال سکی کیونکہ یہ خانہ بدوش اقوام یا تو منگول اور ہن کے مانند یورپ میں تاخت تاراج کے بعد فوراً ہی واپس ہو جاتے تھے یا اگر کچھ پیچھے رہ بھی گئے۔ تو ہنگریوں کے مانند بغیر دوسروں کو متاثر کئے ہوئے خود ہی ان میں مل کر رہ گئے۔ علاوہ ازیں عثمانیہ تمدن کا دوسرا جزو اسلام نمایاں طور پر مروجہ مغربی عیسائیت سے مختلف تھا۔

تاریخ شاہد ہے کہ وسط مشرق کی پرانی تہذیب جس نے اسلام کی پرورش کی اور یونان و روما کی پرانی تہذیب جس سے موجودہ مغربی تہذیب نے حیات پائی۔ دونوں بسا اوقات ایک دوسرے پر اپنا اپنا اثر ڈالتی رہی ہیں۔ سکندر اعظم نے یونان سے اٹھ کر تمام وسط مشرق پر اپنا سکہ جمایا۔ اس کی فتوحات کا سلسلہ شمالی ہندوستان تک پہنچا۔ لیکن فلسفۂ یونان اور روما کا سحر مشرقی عیسائیت کے سامنے باطل رہا۔ اور ہر جگہ اسی مذہب کے خیالات استیلا پا گئے۔ چھ سو

برس گذرنے کے بعد اسلام کا دور دورہ شروع ہوا اکثر ممالک نے اسلام قبول کیا۔ اب دوبارہ فنون اور فلسفہ یونان کو ترقی ہوئی۔ اور مسلمانوں ہی کے ذریعہ سے یہ فلسفہ اور سائنس موجودہ مغربی اقوام تک پہونچے + اس طرح ایک تمدن نے دوسرے پر بڑا گہرا اثر ڈالا + لیکن - مدت دراز کی غیر فیصلہ کن جنگ آزمائیوں کے باعث یورپین عیسائیت اور اسلام میں منافرت پیدا ہوگئی۔ باوجودیکہ بہت سے مذہبی خیالات دونوں قوموں میں مشترک تھے + تماشہ دیکھیے کہ یہی قدر مشترک اور زیادہ باہمی تنفر کا سبب ہوئی + ایک فرقہ دوسرے کو صراط مستقیم سے منحرف تصور کرتا تھا۔ اور یہ سمجھتا تھا کہ موجودہ اختلافات جو اصولی نہیں بلکہ فروعی ہیں۔ بغرض دل آزاری اختیار کیے گئے ہیں + یہ اسباب تھے جن کی بنا پر عثمانیہ تمدن نے دیگر مغربی اقوام کے تمدن سے بالکل مختلف اور حریفانہ شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ غیر مغربی ہی نہیں بلکہ حریفانہ صورت کسی قدر صراحت طلب ہے +

یورپ کی ان اقوام میں جو جلد متمدن ہوگئیں۔ ایک غلط

فہمی عام طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور وہ یہ کہ اناطولیہ میں آکر آباد ہونیوالی قوم کی پستی اس کی خانہ بدوشی سے باعث تھی اور نیز یہ کہ خانہ بدوشی معاشرت و تمدّن کی پست حالت کا نتیجہ ہے + لیکن یہ خیال غلط ہے چونکہ مشاہدہ اس کی صریحی تردید کر رہا ہے۔ مثلاً شمالی سائبیریا کے باشندوں کو دیکھئے کہ وہ کس طرح جانور پال کر اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہاں زراعت پیشہ افراد کا زندہ رہنا تک محال ہے + اصلیت یہ ہے کہ خانہ بدوش اقوام کی کمزوری اس میں نہیں کہ وہ معاشرت کے سطحی مدارج سے۔ زیادہ پیچیدہ اور بلند مدارج تک پرواز نہیں کر سکتے۔ بلکہ کمزوری یہ ہیں ہے کہ نہایت دقیق نظام کے ماتحت وہ ایک ایسا سلسلہ قائم کر لیتے ہیں جس میں کوئی انقلاب خواہ بہتری کے لئے ہو یا بدتری کے لئے۔ بآسانی نہیں ہو سکتا۔ اس کیفیت جمود کو انحطاط یا پستی سے تعبیر کرنا سراسر غلطی ہے۔ ان افراد کو دیمک یا شہد کی مکھی سے مثال دیجا سکتی ہے۔ انفرادی حالت سے ہر چند کہ ان کی جد و جہد مختلف اطراف میں نظر آتی ہے لیکن متفقہ حالات میں وہ ایک ایسے مکمل نظام کے ماتحت ہیں کہ جس سے مفر ناممکن ہے + الغرض خانہ بدوشی

ایک ایسا دقیق نظام معاشرت ہے کہ اگرچہ اس میں مزید ترقی ناممکن ہوجاتی ہے لیکن ایک مقررہ ماحول میں رہکر اس سے زیادہ کامیاب کوئی دوسرا اقتصادی نظام برپانہیں کیا جاسکتا +

اس نظام میں دشواریاں اس وقت پیش آتی ہیں کہ جب جغرافی وجوہات کے باعث یا جذبہ مدنیت کے ماتحت کہ جس کی واضح تعریف علم انسانی سے باہر ہے۔ یہ خانہ بدوش افراد دفعتاً نہایت پابندی کے ساتھ اپنی پرانی روش ترک کرکے شہروں میں بود وباش اختیار کرلیتے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی بدویانہ طاقت کے باعث یہ افراد جدھر رُخ کرتے ہیں اُدھر تسخیر وفتح کے ڈنکے بجاتے چلے جاتے ہیں + توانائی وسختی کی وجہ سے شہروں کے باشندے ان کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے۔ اور قلیل عرصہ میں یہ خانہ بدوش نہایت وسیع ممالک پر قابض ہوجاتے ہیں + اب ان مقبوضات کی وجہ سے ان افراد پر ایک اور ذمہ داری عائد ہوجاتی ہے جس کے متعلق اُن کو نہ کبھی تربیت ملی تھی۔ نہ جس کے لئے وہ فطرتاً موزوں تھے + ان مقبوضات کو مجموعی حالت میں تابع رکھنے کے لیے سیاست تامہ کا ملکہ حاصل کرنا یک بیک ممکن نہیں

اور اس لئے ظاہر ہے کہ یہ افراد ان نئی مشکلات کو حل کرنے کے لئے اپنے
گذشتہ مشاہدات و تجربات کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں کہ جن سے مستفید
ہو کر ایک طرز حکمرانی قائم کر سکیں۔ وہ اب تک خود کو گلہ بان کے
مانند سمجھتے ہیں۔ اگرچہ اب بجائے مویشی کے "رعایا" کا گلہ ہوتا ہے۔
جن کو بہ نسبت مویشیوں کے رام کرنے میں زیادہ وقت صرف ہوتا
ہے "رعیت" کے لغوی معنوں پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔
کہ اس لفظ کے ساتھ کن خیالات کو مناسبت ہے۔ الغرض ان خانہ
بدوش افراد کو اب ایسے وفادار نگہبان آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے
کہ جو نگہبان کتے کے مانند۔ اُن کے گلّے کی حفاظت کر سکیں۔ ہر خانہ
بدوش قوم کو جس نے حکمرانی اختیار کی اس روش پر جو ہمیشہ اس مخصوص
ماحول کا ایک قدرتی نتیجہ ہے۔ چلنا پڑا۔ تاریخ شاہد ہے کہ بیشتر خانہ
بدوش اقوام نے جن کو اس طرح حکمرانی کرنی پڑی۔ اسی دستور حکومت
کو منتخب کیا۔ بلکہ دولت عثمانیہ نے اس دستور حکومت میں کچھ اصلاح
بھی کی اور اپنے اسلاف و ہمعصر دونوں کے مقابلہ میں اس نظام میں
ایک مفید اور امتیازی شان پیدا کر دی۔ غالباً اس مخصوص کامیابی

اور امتیاز کا باعث ان کی اپنی قلیل تعداد اور "رعیت اقوام" کی کثرت اور نیز ان اقوام کا نہایت درجہ متمدن ہونا تھا + بایں ہمہ اس طرز حکومت میں خواہ کتنی ہی کامیابی کیوں نہ ہو۔ اس کے خمیر میں چند خامیاں مضمر ہیں ۔ جو آخر کار زوال کا باعث ہوتی ہیں + کم از کم دو وجوہ سے یہ طرز بالکل خلاف قدرت ہے + اوّلاً تو یہ قطب شمالی کے قریبی برفستانی علاقہ کی زندگی کا نمونہ ہے + دوئم یہ اقتصادی کشاکش کا تحمل نہیں ہو سکتا + چنانچہ یہ کوشش کرنا کہ اس کی بنیاد پر ایک ایسی تعمیر اٹھائی جائے ۔ جو متمدن اقوام اور تہذیب یافتہ شہری باشندوں کے لئے موزوں ہو بذات خود ایک غلطی ہو + سوئم اس نظام کے ماتحت یہ لازمی ہے کہ انسان کی انفرادی حیثیت سے قطع نظر رکھتے ہوئے اس کو صرف اجتماعی حالت میں مویشیوں کے مانند سمجھا جائے ۔ لیکن انسانی فطرت کا خاصہ ہے ۔ کہ وہ ایسے برتاؤ سے دیر یا زود ضرور متنفر ہو کر بر سر پیکار ہو جاتی ہے + چنانچہ دولت عثمانیہ بھی چار صدی کی (۱۳۷۱ء تا ۱۷۷۴ء) حکمرانی کے بعد اس اصول فطرت کی آخر شکار ہو کر رہی + اگر چہ اس طویل زمانہ تک بھی اس کا برقرار رہنا تحیر خیز ہے ۔ چونکہ دیگر اقوام مثلاً ہن تاتاری منگول

اور ہند کے خاندان مغلیہ کا خاتمہ تو مقابلتاً بہت ہی جلد ہوا +

مذکورہ بالا نظریہ چند سے وضاحت طلب ہے عملی حالت سے خانہ بدوش حکمران اقوام کا یہ دستور رہا ہے کہ اپنی شہری رعایا کو مویشیوں کے گلے کے مانند تصور کرتے رہے ہیں + ان سے مال و متاع حاصل کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً تادیب بھی لازمی سمجھی گئی - اور ان کو مطیع رکھنے کے لئے خفیف سرتابی پر بھی جابرانہ اور استبدادانہ رویہ اختیار کیا گیا + مگر اس تعلق بندگی کے علاوہ رعایا کو اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے مکمل آزادی حاصل ہوتی تھی + رعایا کو اطاعت گذار رکھنے کے لئے ایسے افراد منتخب کئے جاتے تھے - جو اسیران جنگ یا زمرہ غلامان میں سے ہوتے تھے + لیکن ان سب کی تربیت اس طور پر کیجاتی تھی کہ وہ عام رعایا سے ہر لحاظ سے مختلف ہوں - یہ "محافظین رعایا" سلطنت کے پرجوش کارکن ہوتے تھے + اور ہر چند کہ وہ اس قدر اہم کام پر مامور ہوتے تھے لیکن اُنپر بھی نگہداشت سختی کیساتھ ہوتی تھی + نیز یہ بھی واقعہ ہے کہ اُن میں سے جو جس قدر زیادہ اہم کام پر مامور ہوتا تھا - اس پر اسی قدر ایمان کی قربانی بھی فرض ہوتی تھی + یہ "محافظین رعایا" ترقی پاکر وزراء اور قائدین عساکر

کے عہدہ تک پہونچ جاتے + لیکن وہ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ فراموش نہ کر سکتے تھے کہ ان کی جس قدر کائنات ہو وہ سلطنت کی ملکیت اور اس کو حکومت پر نثار کرنے کے لئے اُن کو ہر لحظہ تیار رہنا چاہئے + بلکہ اس خیال کا احساس اُن کو اعلیٰ مدارج پر پہنچکر اعلیٰ قدر مراتب اور زیادہ رہتا تھا + اب اس خیال کی اصلیت کا تجزیہ کیجئے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ بالکل وہی خیال ہو کہ جو خانہ بدوش اقوام کی ہر شئے پر خواہ وہ کسی کی ملکیت کیوں نہ ہو۔ سردار قبیلہ کو پورا پورا اختیار ہوتا ہے حتّیٰ کہ موت پر ان کی تمام ملکیت شاہ وقت کے خزانہ میں داخل ہو جاتی تھی + ان محافظین سلطنت کو سگ ہائے "گلہ بان" سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ لیکن یہ تشبیہہ تام نہیں اور اس لئے امتیاز بہتر ہے چونکہ آخرکار یہ بھی اپنے آقا کے مانند ایک ہی صنف کے افراد ہوتے تھے۔ اور یہی باعث ہو کہ اکثر جب حکمران خاندان کا شیرازہ منتشر ہوا تو اس کا جانشین انہیں محافظین میں سے ایک غلام ہو گیا +

ایسی مثالیں تاریخ میں بہت نظر آئیں گی + خاندان ملوک نے جنکی وساطت سے سلطان صلاح الدین نے بارہویں صدی عیسوی

میں اپنے اقتدار کا سکہ ہر جگہ جما یا تھا۔ آخر کار سلطنت کو سلطان
کے کمزور جانشینوں سے چھین لیا + اور یہ بھی اس کا نتیجہ تھا کہ ۱۲۵۰ء
سے ۱۵۱۷ء تک مصر کے حکمران کوہ قاف کے ان عیسائی کاشتکاروں
کی نسل سے رہے جن کو ان کے اہل وطن نے بطور غلاموں کے خرید
کیا تھا + لیکن وہ بھی مثل اپنے آقاؤں کے درجہ غلامی سے امتیاز
شاہی تک پہونچے + ذرا لفظ "مملوک" ہی پر غور کیا جائے تو وہ خود بتا
دے گا کہ یہ لفظ "ملک" سے مشتق ہے یعنی اسی خیال کی تکرار ہے کہ
جو رعایا کو شاہی ملکیت کے علاوہ اور کسی صورت سے پیش ہی نہیں
کرتا + مصر سے قطع نظر کیجئے اور دیکھئے تو قرون وسطیٰ کی تاریخ ہند میں
بھی یہ مثال موجود ہے + ہندوستان میں بھی اسلامی سلطنت کا آغاز
کم و بیش اسی طرح ہوا جیسا کہ اس سے قبل بیان ہو چکا ہے۔ اور
اسی کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ ۱۲۰۶ء سے ۱۲۸۷ء تک تخت دہلی پر غلام ہی
متمکن رہے۔ یکے بعد دیگرے تخت نشینی باپ سے بیٹے کو نہیں بلکہ
آقا سے غلام کو ملی + اور یہ وہ غلام تھے جنھوں نے اپنی قابلیت کے
جوہر ہر شعبہ حکمرانی میں پوری طور سے دکھائے +

دولت عثمانیہ جو اپنے مورث اعلیٰ کے بیٹے کے نام سے
منسوب ہے۔ متواتر ۱۹۲۲ء تک حکومت آل عثمان ہی کہلاتی رہی
پندرہ صدی عیسوی کے آغاز سے دولت عثمانیہ میں ایک نرالی رسم
پڑ گئی تھی + یعنی والیان سلطنت نے باقاعدہ طور پر شادی کی رسم ترک
کر دی۔ اور نسل کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے شریک زندگی کا انتخاب
زمرۂ کنیزاں میں سے کرتے تھے۔ جن کی تربیت بھی اسی معیار پر ہوتی تھی
جیسی اور غلاموں کی + چنانچہ پندرہویں صدی سے لیکر سلطان محمود
دوئم (۱۸۰۸ء تا ۱۸۳۹ء) تک جب ان کنیزوں کا سلسلہ بند کر دیا
گیا تھا۔ شاہان عثمانیہ خود نسل غلامان یعنی کنیزوں کے بطن سے ہوتے
تھے + یہ اسی کی وجہ تھی کہ سلطان محمود دوئم فاتح قسطنطنیہ نے ایک
سنگدل اور بے رحم اصول کی تعلیم اپنے جانشینوں کو دی کہ جس کی تعمیل
میں تخت نشینی کے بعد بھائیوں کا قتل شیوہ شاہی ہو گیا + افراد خاندان
شاہی سے برتاؤ مثل غلام اور "رعایا" کے "اسی گلہ بانی" کے اصول پر ہوتا
تھا + تمام سلطنت کا نظام قصر شاہی کے باغبانوں سے لیکر سلطان
کی ذات خاص تک اس تربیت غلامان پر مبنی تھا + ایسے چند مغربی افراد

کی تحریریں جو سنِ طفولیت میں اسیرانِ جنگ کی حیثیت سے ترکی
میں گئے۔ اور جنہوں نے قبل از رہائی سلسلہ غلامان میں منسلک ہو کر
تربیت پائی۔ آج کل بھی پائے جاتے ہیں۔ ان حالات سے اس
دور کی کیفیت واضح ہوتی ہے۔ ان افراد میں سے ایک نوجوان ہنس شلٹ
برگر بھی تھا جو ۱۳۹۶ء میں جنگ نکوپولس میں گرفتار ہو کر غلامان عثمانیہ
میں شامل ہوا۔ ترکی فوج کے ہمراہ جنگ انگورا میں ۱۴۰۲ء میں تیمور
کے خلاف لڑا۔ اور دوبارہ اسیر جنگ ہو کر وسط ایشیا میں لایا گیا۔
لیکن وہاں سے رہا ہو کر جرمنی واپس گیا۔ اور اسی نے اپنے تحیر خیز
حالات کو قلمبند کیا لیکن ایک صدی بعد جنیوا کے ایک نوجوان منیاوینو
نے پھر وہی واقعات لکھے۔ ان حالات اور دیگر ہمعصر تحریرات
سے جو ان رہائی یافتہ غلاموں نے قلمبند کیں۔ اس سلسلہ کی پوری
پوری کیفیت معلوم ہوتی ہے کہ جس کے باعث سلطان عثمانیہ حکمرانی کی
بہترین مثال نہ صرف نظام ملکی میں بلکہ فنون جنگ میں بھی کئی صدی
تک پیش کرتی رہی۔

وہ نوجوان جو مختلف طرح سے ترکوں کو دستیاب ہوتے تھے

اول تین یا چار سال کے لیے انا طولیہ کے اندرونی حصوں میں بھیج دیئے
جاتے تھے کہ ترکی زبان پر دسترس حاصل کریں اور وہاں کی سخت
زندگی گذار کر اپنی جسمانی حالت درست کریں + اس کے بعد وہ قسطنطنیہ
واپس کر دیئے جاتے تھے جہاں پر کچھ تو قصر شاہی کے باغبانوں میں
شامل ہو جاتے تھے اور کچھ مختلف کاموں کے لیئے بحیثیت مزدور بھیج دیئے
جاتے تھے + یہ دو مراحل طے کرنے کے بعد جو بہترین قابلیت
دکھاتے ان کا انتخاب خاص طور پر کیا جاتا تھا اور اُن کو "جان نثاروں"
کے زمرہ میں جگہ دیدی جاتی تھی۔ "جان نثاروں" کی مشہور و
معروف پیادہ فوج پوری طرح سے تربیت یافتہ و آراستہ و پیراستہ
ہوتی تھی + لیکن ان کی تعداد مقرر تھی یعنی سلطنت کے زوال سے
قبل اس جماعت کی تعداد کو بارہ ہزار سے متجاوز نہ کرنے دیا گیا + یہ وہ
ہی مشہور اور بہادر فوج تھی جس کی بہادری کے غلغلہ سے جنگ
آزمایان یورپ کے دل دہل جاتے تھے + ان تمام خوبیوں
کے باوجود "جان نثار" عموماً اس مرتبہ تک نہ پہونچ سکتا کہ عنان
حکومت اس کے ہاتھ میں دیدی جاتی + بلکہ اس کام کے لیئے "محافظین

رعایا" مقرر ہوتے تھے۔ جن کا انتخاب شروع ہی سے اسی مقصد کے لیے کیا جاتا تھا۔ ان کو بجائے اناطولیہ کے اندرونی حصہ میں بھیجنے کے قیامی درسگاہوں میں جو قسطنطنیہ۔ ایڈریانوپل۔ اور باسفورس کے کنارہ پر واقع تھیں۔ بارہ بارہ سال تک رکھا جاتا تھا۔ اور اس دوران میں سخت نگرانی کے ساتھ ایک خاص نصاب کی مکمل تعلیم دیجاتی تھی۔ یہاں ان کے نصاب میں فارسی اور عربی ادب کے علاوہ۔ ورزش کھیل اور فوجی فنون بھی شامل ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں ایک نہ ایک فن دستکاری بھی سکھایا جاتا تھا۔ زندگی کی عملی تعلیم کے حصول کے لئے ان کا بارگاہ شاہی سے تقرب کر دیا جاتا تھا۔ اور جو جس قدر قریب ہو جاتا۔ اس کو اسی قدر اہم اور دقیق کام پر مامور کیا جاتا تھا۔ یہ تقرر کم وبیش پچیس سال کی عمر میں وقوع میں آتا تھا۔ اس وقت ان میں سے ہر ایک کو سلطان کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ شاہی التفات سے ذاتی طور پر مشرف ہو سکے۔ اس موقع پر ان کو ایک گھوڑا مع ساز و سامان کے عطا کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ انتخاب آخری نہ تھا چونکہ کچھ عرصہ کے امتحان خدمت کے بعد

ایک مرتبہ پھر انتخاب کیا جاتا۔ اور مقابلتاً نا اہل کو فوجی رسالہ کے لئے مخصوص کر دیا جاتا تھا۔ صرف بقیہ چند افراد کو خاص خدمات کی بجا آوری کے لیے مقرر کر دیا جاتا۔ جہاں سے وہ رفتہ رفتہ ترقی پا کر صوبوں کے ناظم افواج کے قائدین اور سلطنت کے وزرا ہو جاتے تھے۔

وہ اصول جن پر اس تربیت کی تمام تر بنیاد تھی۔ مختصراً یہ تھے کہ تمام مدارج میں نہایت شدت کے ساتھ نگرانی رکھی جاتی تھی خاص باتوں کو ملحوظ رکھکر مختلف مدارج کے لیے انتخاب کیا جاتا تھا۔ ہر شعبہ کی امتیازی خصوصیات مقرر کر دی گئیں تھیں۔ اور تعلیم و تربیت میں ان کا خاص طور پر لحاظ کیا جاتا تھا۔ امیدواران میں خود ایک رقیبانہ مقابلہ کا احساس پیدا ہو جاتا تھا۔ کہ جس قدر جلد ممکن ہو اعلےٰ مناصب پر پہونچیں۔ مدارج ترقی کا معراج وزیر اعظم کا عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ ان امیدواروں کو شروع سے ہی ان کے درجہ کے مطابق مشاہرہ بھی ملتا تھا۔ اور اس وجہ سے ان کے رقیبانہ احساس میں اور بھی شدت پیدا ہو جاتی تھی۔ باینہمہ ایک بھی ایسی مثال موجود

نہیں کہ ان امیدواروں کو زبردستی اسلام لانے کی ترغیب دی گئی ہو۔ لیکن چونکہ ان کی تربیت ایک ایسی عمر سے شروع ہوجاتی تھی کہ جب انسان کا قلب بہت جلد متاثر ہوجاتا ہے اس لئے وہ خود بخود اسلامی ماحول کا اثر ایک غیر ارادی حالت میں قبول کر لیتے تھے اور ہمیشہ خود اپنی مرضی سے مشرف باسلام ہوجاتے تھے + تاہم یہ امیدوار جو اکثر پہلے عیسائی ہوتے تھے + باوجودیکہ تمام زندگی سلطان کی خدمت میں صرف کر دیتے تھے لیکن بلا روک ٹوک اپنے والدین سے راہ ورسم برابر جاری رکھتے تھے + ایاز کی مثال پیش نظر ہے۔ یہ البانیہ کا باشندہ ترقی کر کے شاہ سلیمان کے عہد میں سویم وزیر سلطنت ہوگیا تھا۔ لیکن برابر اپنی ماں کو جو ایک مذہبی خانقاہ میں داخل ہوگئی تھی۔ سالانہ گذارہ دیتا رہا + اسی طرح سوکولو بھی شاہ سلیمان کے اختتام عہد میں وزیر سلطنت کے عہدہ پر ممتاز ہوگیا تھا۔ لیکن اوائل عمر میں یہ گرجا کی ملازمت میں داخل ہوچکا تھا اور وزیر ہونے پر بھی برابر اپنے پرانے مذہب کی مالی امداد کرتا رہا + اس تمام نظام کا اصل اصول یہ تھا کہ پیدائشی مسلمان سلطان کی ذاتی خدمت

یعنی زمرۂ "غلامان" میں داخل نہ ہو سکتے تھے۔ اور اسی طرح ان نومسلم غلاموں کی اولاد بھی بحیثیت آزاد مسلم کے سلسلہ حریت میں منسلک ہو جانے پر اپنے والدین کی طرح غلامان سلطان میں داخل نہ ہو سکتے تھے، چنانچہ اس قاعدہ کے ماتحت یہ یقینی امر تھا کہ وہ افراد جو نظام سلطنت کو برقرار رکھیں گے۔ عوام میں سے منتخب کئے جائیں گے ان کی تمام سفارش ان کی ذاتی قابلیت اور استعداد ہو گی۔ لیکن ان کو اپنے عہدہ جلیلہ پر کوئی خاندانی حقوق حاصل نہ ہوں گے کہ جس کے ذریعہ وہ ایک ایسے خاندان کی بنیاد ڈال سکیں جو شاید کبھی آئندہ اپنے آقا کی نسل کے بجائے خود عنان حکومت سنبھالے، لیکن اس لحاظ سے بھی یہ نظام خلاف فطرت تھا۔ آزاد مسلم جماعت جس کی ایک بڑی تعداد افواج میں شامل تھی۔ اس کو اپنی حق تلفی سمجھتی تھی + اور وہ مسلم غلام بھی جو اپنے استعداد کے وسیلہ سے ترقی پا کر ممتاز سے ممتاز عہدہ پر پہونچ جاتے تھے، اس کے باعث مکدر رہتے تھے۔ کہ ان کی اولاد کو ان کی جگہ نہ دی جائیگی، مسلم جماعت جو حکمران قوم تھی محض اس وجہ سے کہ وہ حلقہ اسلام میں شامل

تھی۔ ان ممتاز مراتب سے محروم تھی + لیکن ۱۸۶۲ء کے بعد کہ جب سلطنت عثمانیہ کی زندگی کی دو صدیاں گذر چکی تھیں اس اصول کی پابندی میں فرق آنا شروع ہو گیا + انہیں غلام عہدہ داروں سے سلاطین کو مجبور کیا کہ ان کی اولاد کو مثل ان کے بارگاہ شاہی میں خدمات دیجائیں۔ چنانچہ ان کی تتبع میں آزاد مسلمانوں نے بھی اپنی حقوق کا مطالبہ کیا۔ اور آیندہ کے لیئے ان دونوں جماعتوں پر سے قیود پارینہ ہٹا دی گئیں + لیکن اس زمانہ سے ترکی محکمہ جات میں انحطاط شروع ہو گیا + حتیٰ کہ "عیسائی رعایا" پر بھی گذشتہ اقتدار باقی نہ رہا +

اس سے قطع نظر نظام حکومت عثمانیہ دیگر حالات کی رو سے بھی مغربیت سے مختلف تھا + مغربی ممالک میں جلد ہی اس امر کا احساس ہو گیا تھا کہ انسانی تمدن میں کامل حریت کے لیئے مساوی حقوق لازم ہیں۔ مساوات حقوق کا انحصار قومیت پر ہو سکتا ہے۔ نہ کہ مذہب پر + یعنی ایک جگہ کے باشندے اپنی یکساں حالت کے باعث بہت جلد ایک مخصوص جماعت بن سکتے ہیں + چونکہ اس جماعت کو مجموعی حالت

سے ایک مقامی امتیاز حاصل ہوگا، خواہ وہاں کے افراد مختلف مذاہب
کے پیرو ہوں۔ یعنی تقسیم انسانی مقامی حالات کے معیار پر کی جائے
نہ کہ مذہب اور فرقہ کی رو سے۔ لیکن خانہ بدوش اقوام میں یہ تقسیم
جداگانہ معیار پر ہوتی ہے۔ ان اقوام کے افراد تین فرقوں میں منقسم ہوتے
ہیں جو ایک دوسرے پر فوقیت رکھتے ہیں اور جن کے فرائض منصبی
بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ یعنی اولاً حکمران افراد
جن کو تشبیہ "گلہ بانوں" سے دی گئی ہے۔ دوئم "محافظین رعایا" جنکی
حیثیت ایک نگہبان کتے کی ہوتی ہے۔ جو کہ گلہ کی حفاظت کرتا ہے۔
اور سوئم "رعایا" یعنی وہ افراد جن کی حالت ایک گلہ میں مویشیوں کے
مانند ہے۔ چنانچہ اُن مختلف طبقوں میں مساوات کا کوئی احساس نہ ہوتا
ہے نہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ان کے لئے مقامی حیثیت سے تقسیم بھی
بے معنی بات ہے چونکہ یہ متواتر ایک جگہ سے دوسری جگہ تلاش معاش
کے لئے سرگرداں رہتے ہیں۔ یا ہمہ ایک طبقہ کی زندگی دوسرے طبقہ
پر منحصر ہے چونکہ مجموعی حالت میں یہ تینوں طبقے بذات خود ایک نظام
میں داخل ہوتے ہیں سلطنت عثمانیہ نے اپنے پرانے نظام کو ترک

نہ کیا بلکہ اس بنیاد پر سلطنت کی تعمیر کی + سلاطین کے ذاتی غلام جن پر
حکومت کا تمام دارومدار ہوتا تھا کسی خاص جگہ مقیم نہ ہوتے تھے۔
بلکہ تمام سلطنت میں بکھرے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ سلاطین کا خود قیام
کسی خاص دارالسلطنت میں مستقلاً نہ رہتا تھا۔ بلکہ اکثر ایک جگہ سے دوسری
جگہ جاتے رہتے تھے + ان محافظین کے ماتحت "رعایا" بھی مختلف
فرقوں میں منظم تھی + یہ ماتحت طبقہ یعنی "رعیت" کسی خاص علاقہ سے
منسوب نہ ہوتی تھی + بلکہ یہ وسیع اور منتشر فرقے ملت کے نام سے معروف
تھے + لیکن اس ملت کو قومیت کا ہم معنی سمجھنا سخت غلطی ہے + کیونکہ
لفظ "قومیت" کیساتھ ذہن ایک ایسے گروہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے
جو متفقہ حالت میں ایک خاص مقام پر آباد ہو + اور جس کے بیشتر
افراد ایک ہی زبان بولتے ہوں + حالانکہ سلطنت عثمانیہ میں چند ایسی
ملتیں بھی تھیں۔ جو ہر مقام پر اقلیت میں آباد تھیں اور جو مختلف مقامات
پر مختلف زبانیں بولتی تھیں + علاوہ ازیں اگر "ملت" کو مذہبی فرقہ سمجھا
جائے۔ تو یہ بھی غلط ہوگا۔ کیونکہ ہر چند صدر ملت کو مذہبی اعزاز حاصل
ہوتا تھا۔ لیکن در اصل ہر ملت کی حیثیت سیاسی طور پر نظام عثمانیہ میں ایک

جزو کے مانند تھی + اپنے افراد میں امور مذہبی کے متعلق انتظام کرنا "ملت"
کا فرض ہوتا تھا + مرگ و پیدائش اور شادی و وصیت کے متعلق کاغذات
کی ترتیب بھی ملت ہی کے سپرد تھی - ہر ملت کی جداگانہ عدالت
تھی + جس میں اپنے خاص قوانین کے مطابق فیصلہ کئے جاتے تھے +
تمام دیوانی نالشوں پر بھی اس عدالت کو اختیار حاصل تھا - ضروری
اخراجات برداشت کرنے کے لئے وہ ٹیکس بھی عائد کرتی تھی -
یہ سب ایسے حقوق ہیں جو مغربی ممالک میں محض حکمران طبقہ کے لئے
مخصوص ہیں + لیکن سلطنت عثمانیہ نے یہ تمام فرائض مختلف ملتوں کے
سپرد کر رکھے تھے - اور ان فرائض کو انجام دینے کے لئے ہر ملت اپنے
اہلکار - حکام اور فوج علیحدہ علیحدہ مقرر کرتے تھے + سب سے زیادہ
فوقیت ملت اسلامیہ کو حاصل تھی + ہر چند کہ مسلم جماعت کے لئے لفظ
"ملت" کا استعمال عام طور پر رائج نہ تھا + شریعت اسلامیہ جس کی تاویل
مفتیوں کی رائے کے مطابق کی جاتی تھی - آئین مروجہ تھا - اور اسی
کے مطابق قاضی فیصلہ کرتے تھے - شیخ الاسلام جس کا قیام قسطنطنیہ
میں رہتا تھا - صدر ملت تصور کیا جاتا تھا + اسی ملت میں تمام آزاد

مسلم زمیندار و کاشتکار شامل ہوتے تھے۔ اور ہر چند کہ نومسلم غلامانِ سلطان کسی خاص قانون کے ماتحت نہ تھے لیکن عام طور پر ان کا شمار بھی اسی ملت میں ہوتا تھا۔ دوسرے درجہ پر ملت رومیہ تھی۔ جس میں عیسائی مذہب کے ایک خاص فرقہ کے تمام پیرو شامل تھے۔ ان کا صدر ملت بھی قسطنطنیہ میں مقیم تھا اور اس ملت کے افراد اور سلاطین کے درمیان جملہ امور اسی کے معرفت طے ہوتے تھے۔ یہ صدر ملت یونانی ہوتا تھا۔ اور اس لئے یونانیوں کو اہل بلغاریہ سربیا البانیہ پر فوقیت حاصل تھی۔ ان کے علاوہ یہودیوں عیسائیوں اور ارمینیوں کی بھی ملتیں تھیں۔ کچھ اور مختلف فرقوں کے ایسے عیسائی بھی آباد تھے۔ جو یورپ کے دیگر ممالک مثلاً فرانس۔ ہالینڈ و انگلستان کی رعایا تھے۔ اور بیشتر بندرگاہوں میں مقیم تھے ان کو بھی اصول ملت کی مطابقت میں آزادی حاصل تھی۔ یہ اپنے سفیر و قونصل کے ماتحت رہتے تھے۔ یہ حقوق قونصل کو سلاطین کی جانب سے وقتاً فوقتاً فرامین کے ذریعہ سے عطا ہوتے رہتے تھے۔ اور سلاطین کی مرضی کے مطابق منسوخ بھی کئے جا سکتے تھے۔ محض فرانس کے ساتھ

ان تعلقات کی بنا صلح نامہ ۱۵۳۵ء پر تھی جس کے دونوں فریق پابند تھے۔ یہ آبادیاں تجارتی مقصد کے لئے وقوع میں آگئی تھیں۔ سلاطین ان کو اسی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ جس نگاہ سے ان کی خانہ بدوش آباواجداد نخلستان کے رہنے والوں کو دیکھا کرتے تھے۔ خانہ بدوش کی زندگی میں نخلستانی آبادی ضروریات جسمانی اور اکثر تکلفات زندگی کی فراہمی کی کفیل ہوتی ہو۔ مغربی ممالک کے باشندگان کی تجارتی آبادیوں کا مقصد بھی یہی تھا۔ ان تجارتی آبادیوں کے باشندے اپنا انتظام خود کرتے تھے۔ اور جبتک خاموشی سے ٹیکس ادا کرتے رہتے تھے ان سے کبھی مشرقی عیسائی "رعایا" کے مانند روک ٹوک نہ کی جاتی تھی۔

سلطنت عثمانیہ کا یہی نظام ۱۷۷۴ء تک برقرار رہا۔ لیکن ملک میں انقلابی کیفیت رونما ہوچلی تھی۔ کم وبیش ایک صدی قبل سے ترکی۔ یورپ کے مقابلہ میں نیچا دیکھ رہی تھی۔ اور خاصکر روس نے نہایت نقصان دہ شکست دی تھی۔

ایک صدی قبل روس کی حالت خود حد درجہ پست اور خراب

تھی۔ لیکن روس نے یورپ کے نقش قدم پر چلنا اسی وقت شروع
کر دیا تھا جو وقت ترکی کی جنگی ناکامیوں کا ابھی آغاز تھا۔ ترکی کی
شکست کے بعد یہ حقیقت آشکارا ہو چلی تھی کہ جنگ روس و ترکی (۱۸۶۴ء
تا ۱۸۷۷ء) میں روس کیوں کامیاب رہا۔ اور اس واقعہ کا گہرا اثر
سلطنت عثمانیہ اور اس کی عیسائی رعایا پر بھی ہوا۔

باب تین

مغربیت کا اثر

یہ عجیب تاریخی واقعہ ہے کہ دولت عثمانیہ سے ایک صدی قبل اس کی رعایا نے خود بخود یورپ کی طرف رجوع کیا + اس واقعہ کا اظہار سترہویں صدی کے آخر میں کسی قدر دفعتاً ہوا + اس کی اہمیت اس لیئے اور بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے کہ باوجود مذہبی یکسانیت کے مشرقی عیسائی مغربی عیسائیوں سے نا آشنا تھے + اسی زمانہ میں روس بھی یورپ کی طرف رجوع کر رہا تھا + اور اگر دور اولین سے قطع نظر کر لی جائے تو حروب صلیبیہ کے دوران میں مشرقی اور مغربی خیالات و تہذیب کو ایک دوسرے سے آشنا و متاثر ہونے کا پہلا موقع ملا تھا + حروب صلیبیہ غیر فیصلہ کن جنگ ثابت ہوئی لیکن اگر پھر بھی کوئی ان کا شکار رہوا۔ تو مشرقی عیسائی + اس دور میں مغربی عیسائیوں کے تند جوش اور خوفناک حملوں سے ان کے مشرقی بھائی بھی واقف ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے

ساتھ یہ راز بھی سربستہ نہ رہا تھا کہ یہ سب جدوجہد ملکی اقتدار و تجارتی فوقیت کے لئے ہے۔ اس دور کا ایک اور حیرت انگیز واقعہ یہ تھا کہ ترکوں کے قریبی عزیز منگول جو اس وقت بلائے بے درمان کے مانند وسط ایشیا سے اُٹھ کر قہر الٰہی کی طرح قرب و جوار میں حملہ آور ہو رہے تھے۔ اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ مغربی افواج صلیبیہ سے متفق ہو کر وسطی دنیائے اسلام کو نیست و نابود کر دیں۔ بہرحال یہ وقوع میں نہ آیا اور فاتح منگول۔ اسلام کی خاموش اور بظاہر مفتوح رو کے سامنے زیر ہو گئے۔ مگر تاہم خانوادہ عثمانیہ کے قدم منگولوں کے سامنے نہ جم سکے اور وہ اپنے ملک کو چھوڑ کر اناطولیہ میں آباد ہو گئے۔ یہ اناطولیہ کے نوآباد بھی اسلام کے حلقہ میں آئے۔ لیکن انہوں نے اپنی پرانی خانہ بدوشانہ طرز نہ چھوڑی۔ چنانچہ اب اسلام کے نام پر انہوں نے اپنی مفتوحات کا آغاز کیا اور رفتہ رفتہ عیسائی ممالک پر قبضہ کرتے چلے گئے۔ ان فتوحات کا جو ۱۳۵۵ء سے ۱۳۷۲ء تک وقوع میں آئیں بیشتر دارومدار سلاطین کے غلاموں کی قابلیت پر تھا۔ لیکن یہ واقعہ بھی کہ مشرقی عیسائی اپنے مغربی عیسائی

حکمرانوں سے تنگ آچکے تھے۔ ان اسلامی فتوحات کا ممدّ ومعاون ثابت ہوا۔ آخری محاصرہ قسطنطنیہ کے وقت ۱۴۵۳ء میں ایک بازنطینی سربرآوردہ نے کہا تھا کہ عمامۂ رسول۔ طرۂ پوپ سے بہتر ہے۔ اور درحقیقت ابتدا میں مشرقی عیسائیوں کے لیے یہ نیا طرز حکومت بہت مفید ثابت ہوا۔ مگر تصویر کا دوسرا رُخ دیکھیے۔ یہ واقعہ بھی کہ اگر مشرقی عیسائیوں کی یہ ذہنیت نہ ہوتی تو دولت عثمانیہ کو اس قدر وسیع مملکت پر قابض ہونے کا موقع غالباً نہ ملتا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی درست ہے کہ اگر سترہویں صدی میں مشرقی عیسائی یورپ کی طرف رجوع نہ ہوتے تو ہر چند کہ سلطنت عثمانیہ میں زوال کے آثار نظر آنے لگتے لیکن اس قدر شدت اور سرعت کے ساتھ سلطنت کا انہدام نہ ہوتا۔ جیسا کہ دراصل وقوع میں آیا۔ یہ غیر مسلم ممالک کے باشندوں اور ملکی "رعایا" کے اندرونی نظم ونسق سے الگ تھلگ رہنے کا نتیجہ تھا کہ سلاطین عثمانیہ نے ان کو وقتاً فوقتاً بیحد وسیع اور فیاضانہ مراعات عطا کیے۔ جب تک کہ نظام سلطنت درست اور استوار رہا حکومت کا اثر بیرونجات اور

شہروں میں قائم رہا اور اس وقت تک ان مراعات کے ناجائز
استعمال کا کوئی خدشہ پیدا نہ ہوا۔ بلکہ سلاطین اور ان کے کارکن غلام
ان ملتوں کے انتظام سے سبکدوش رہے۔ لیکن اولاً یہ خطرہ جنگ
۱۶۸۳ء و ۱۶۹۹ء کے بعد رونما ہوا۔ مگر اس وقت ان مراعات
کو دیئے ہوئے اس قدر زمانہ ہو چکا تھا کہ ان کا واپس لینا بوجوہ
محال تھا۔

شروع میں عیسائی رعایا اور مشرقی باشندے بذات
خود کمزور رہتے اور ایک دوسرے کے خلاف ہمیشہ آمادہ بہ جنگ
رہتے تھے۔ سلطنت کو ان کے درمیان امن قائم رکھنا پڑتا تھا۔
اس لیے حکومت کو ان مراعات سے کبھی کسی قسم کا اندیشہ نہ ہوا۔
سلطنت عثمانیہ نے تمام تجارتی کاروبار بھی اپنے عیسائی رعایا
کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مشرقی عیسائیوں
نے تجارت میں کچھ بہت فروغ نہ پایا۔ اس پسماندگی کی ایک وجہ
مشرقی عیسائیوں کی مغربی عیسائیت سے نفرت تھی۔ اس نفرت
کا باعث یورپ کے عیسائیوں کی وہ زیادتیاں اور سفاکانہ حرکات

تھیں جو انہوں نے قرون وسطیٰ کے دور تنظیم میں جائز رکھی تھیں اور جن کی پریشان کن یاد اس وقت تک مشرقی عیسائیوں کو بے چین کر دیتی تھی + یورپ کے عیسائی ممالک میں مذہبی اعتقادات کے اختلاف پر سخت سے سخت تکالیف دینا بھی روا سمجھا جاتا تھا اور اس وجہ سے نفرت روز بروز بڑھتا گیا لیکن سترھویں صدی کے آخر میں اس ذہنیت میں رفتہ رفتہ تبدیلی ہوئی - اب استبداد پر رواداری ترجیح پا رہی تھی + بعد زمانی کے باعث بھی پرانے زخم مندمل ہو چلے تھے - اور اس لیے مغرب کا رنگ جمنا آسان ہو گیا + ادھر زار روس پیٹر اعظم بھی سریر آرائے سلطنت ہو چکا تھا + پیٹر غالباً مشرقی عیسائیوں میں پہلا اور سب سے معروف مغربیت پسند شخص ہے - اس نے ہالینڈ اور انگلستان میں جا کر بذات خود مغربی تمدن کا مطالعہ کیا اور واپسی پر اپنے علم سے اپنے ہم وطنوں کو استفادہ پہنچایا + اس کے شاہی اثر سے مغربی خیالات روس میں عام رواج پا گئے - اسی زمانہ میں ایک مخصوص یونانی طبقہ بھی یورپ کے علوم و خیالات کی طرف رجوع ہوا + تجارتی نقل و حرکت کے باعث یونانی یورپ کی

زبانوں سے واقف ہو چلے تھے - انہوں نے یورپ کے علوم
خیالات سے مستفید ہو کر سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا میں
مغربی خیالات کی تلقین شروع کی - اور اگرچہ اس امر کو روس کی
تحریک کے مقابلہ میں زیادہ شہرت حاصل نہیں ہوئی - لیکن اس
کے مقابلہ میں اس کا اثر زیادہ گہرا اور وقیع ہوا + ایک صدی سے
کم ہی عرصہ میں اس تحریک کے اہم اثرات رونما ہونے لگے + جنگ
۱۶۸۳ تا ۱۶۹۹ء کے بعد سے ترکی کو یورپ کے مقابلہ میں اکثر
لڑائیوں میں ناکامی ہوتی رہی + شرائط صلح کے لئے اکثر طویل گفت
و شنید کی نوبت آتی اور اس خدمت مفاہمت کے لئے ترکوں
کو اپنی عیسائی رعایا کے ان افراد کی مدد درکار ہوتی جو مغربی عادات
اور زبانوں سے واقف تھے + چنانچہ ان عیسائیوں کے لئے نئے
ملازمانہ اور سیاسی مراتب قائم کئے گئے - اور چونکہ وہ خاص قابلیت
اور استعداد سے بہرہ مند تھے - اس لئے یہ لازمی نہ تھا کہ وہ اپنے
ان ہم مذہب افراد کے مانند جو گذشتہ صدیوں میں سلاطین کے
زمرۂ غلامات میں شامل ہوتے تھے - تربیت حاصل کریں اور اسلئے

وہ اپنی معاشرت اور مذہب دونوں پر قائم رہتے تھے۔ اسی زمانہ میں روس نے یورپ کے اتباع میں اپنی عساکری۔ اقتصادی اور عاملانہ حالت بالکل تبدیل کر لی تھی۔ روس جو ایک صدی قبل عیسائی ممالک میں سب سے غیر مہذب شمار ہوتا تھا اور جو تاتاری حملوں کے باعث عاجز ہو چکا تھا۔ اب اس قابل ہو گیا کہ میدان جنگ میں عساکر عثمانیہ کو شکست فاش دے۔ جنگ روس و ترکی ۱۷۶۸ء تا ۱۷۷۴ء کا خاتمہ صلح نامہ کوچک کینارجہ کی رو سے ہوا جس کے ذریعہ روس کو علاوہ دیگر مراعات کے کریمیا اور بحر اسود پر اقتدار حاصل ہو گیا۔ ترکی کو اس ہزیمت سے اس قدر زحمت صدمہ پہنچا کہ اس نے با میدِ اصلاح و بہوائے کامرانی یورپ کی تتبع شروع کی اور اس پیروی کا آغاز پیٹر کے اصول پر فوجی تنظیم و تنسیق سے ہوا۔ ترکی میں یورپ کی تقلید۔ افواج کی تنظیم و تنسیق سے شروع ہوئی اور مغربیت کا اثر پہلے اس شعبہ پر پڑا۔ چنانچہ مزید تتبع کا باعث یہی شعبہ ہوا۔ ترکوں میں اس تقلید کا احساس از خود کسی باہمی مغربی اختلاط کے باعث نہیں ہوا۔ بلکہ صلح نامہ کوچک کینارجہ کے بعد ترکوں نے یہ

نہایت مایوسی سے محسوس کیا کہ یورپ کا فوجی مقابلہ یورپین اسلحہ
اور انہیں کی قواعد رزمیہ کو اختیار کرنے سے ہو سکتا ہے۔ اور اس
لئے ارادتاً اپنی فوج کو مغربی طرز پر تربیت دینا شروع کیا + لیکن ترکوں
نے حالات سمجھنے میں غلطی کی + یورپ کی عساکر قوت ملک کی عام ترقی
کے باعث تھی۔ نہ کہ بذات خود ایک الگ تحریک کی حیثیت سے +
اس لئے یہ ظاہر تھا کہ ایک غیر مغربی ملک کو جو یورپ کا چربہ اتارنا چاہتا
ہو سب سے قبل اپنی اقتصادی۔ انتظامی اور عاملانہ حالت کو سدھارنا
چاہیے کہ جس پر یورپ کی فوج کا انحصار ہے + چنانچہ یورپ کی محض
فوجی تقلید ایک غلطی تھی۔ لیکن ان حالات میں ترکوں کے لئے اور
کوئی چارہ نہ تھا + بہرحال صلحنامہ ۱۷۷۴ء سے ڈیڑھ سو سال تک
ترکی اسی شعبہ میں مغربیت کا اثر قبول کرتی رہی۔ انیسویں صدی کے نصف
اول میں سلطان سلیم سوم اور سلطان محمود دوم ترکی میں اور
محمد علی مصر میں برابر اپنی نئی طرز کی فوج پر خاص توجہ مبذول کرتے
رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بمقابلہ دیگر رعایا کے افسران فوج مغربیت
سے بہت زیادہ متاثر ہوتے گئے۔ اور آئندہ کی جملہ انقلابی

کوششوں میں انہیں فوجی افسروں نے نمایاں حصہ لیا۔ سلطان عبدالحمید ۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۸ء نے بھی ترکی افسروں کی مغربی تربیت کو بند نہیں کیا۔ حالانکہ اس کی سختی کا یہ عالم تھا کہ بیرونی ممالک کی تصانیف کا داخلہ بھی اپنی سلطنت میں بالکل ممنوع قرار دیا تھا۔ مغربی فوجی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اولاً یہ لازمی ہوتا تھا کہ مغربی زبانوں میں مہارت پیدا کی جائے اور جب زبان پر دسترس حاصل ہو تو اُس زبان کا تمام خزانہ علوم پیش نظر ہوتا ہے۔ اس طرح پر یہ نوجوان ترکی افسر اول مغربی زبانوں۔ اور بعدازاں مغربی خیالات سے واقف ہو جاتے تھے۔ اور انہیں خیالات سے متاثر ہو کر اور اپنے ملک کی پست حالت دیکھکر یہ انقلاب پسند جماعت میں شامل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ انور بے کہ جس نے ۱۹۰۸ء میں سلطان عبدالحمید کے خلاف انقلابی پرچم بلند کیا اور پھر مصطفےٰ کمال کہ جس نے نہایت درماندگی کی حالت میں یورپ کے تمام ممالک کا مقابلہ کیا اور ۱۹۲۰ء میں نہایت بیباکی اور بلند آہنگی کے ساتھ آزادی کا اعلان کیا۔ دونوں نوجوان فوجی

افسر تھے۔ نوجوان ترکوں کی انقلابی تحریک ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۸ء تک ناکامیاب ثابت ہوئی۔ اس کی وجہ زیادہ تر یہی تھی کہ انقلاب پسند جماعت میں فوجی سپاہیوں کی اکثریت تھی۔ جو تربیتاً ملک کی سیاسی اور انتظامی حالت کے درست کرنے کے لئے غیر موزوں تھے۔ لیکن اسوقت بھی انور بے کے دو حامی طلعت بے اور جاوید بے غیر فوجی جماعت کے افراد تھے۔ طلعت بے سالونیکا کے تار گھر میں ملازم تھا اور جاوید بے ایک یہودی نژاد مہاجن تھا اور ان دونوں نے مغربی طرز پر تعلیم پائی تھی۔ کچھ مدت بعد ایک اور انقلابی تحریک وجود میں آئی۔ اس کا مقصد بیرونی حملہ آوروں سے اپنے ملک کو نجات دلانا تھا۔ اس تحریک کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ انقلاب پسند جماعت میں غیر فوجی افراد بکثرت موجود تھے۔ اول الذکر تحریک اگرچہ ناکام رہی لیکن یہ اسی کا اثر تھا۔ کہ ایک بڑی تعداد مرد و خواتین کی مغربی تعلیم سے بہرہ اندوز ہو رہی تھی اور اب جبکہ دوسری تحریک رونما ہوئی تو غیر فوجی افراد کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۷۷ تا ۱۹۱۸ء کے دوران میں مغربیت

کا اثر عوام پر رفتہ رفتہ ہو رہا تھا۔ لیکن خود ترکوں کو اپنی عیسائی
رعایا۔ روس۔ اور یونان کے مقابلہ میں مغربی تقلید کے سلسلہ میں
زیادہ دقتیں اُٹھانی پڑیں۔ ان مشکلات کے چند وجوہ حسب ذیل
ہیں۔ اولاً اسی تحریک کی ابتدا سلطنت کی منشا سے ہوئی نہ کہ جمہور
کی خواہش سے۔ دوئم۔ اس تحریک تقلید کا مقصد فوجی اصلاح تھی
جس کا احساس روس اور یونان کی اتباع میں تھا کہ جو مغربی آئین
کی پیروی کم وبیش ڈیڑھ سو سال سے کر رہے تھے۔ سوئم۔ اس
تحریک کے دوران میں یعنی صلحنامہ کوچک کینارجہ ۱۷۷۴ء سے صلحنامہ
پیرس ۱۸۵۶ء تک سلطنت عثمانیہ کی حالت بہت نازک تھی۔ کہ
جب نہ صرف بیرونی حملہ آور روس کا خوف تھا۔ بلکہ باغی عیسائی
رعایا کا بھی۔ چہارم۔ وجوہات مذکورہ کی بنا پر انقلابی جماعت میں
فوجی افراد کی اکثریت ہوتی تھی۔ جس کے باعث حالات اور بھی پیچیدہ
ہو جاتے تھے۔ پنجم۔ علاوہ ان سب مصائب کے غلامان سلاطین
اور اسلامی معاشرت کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا جو بمقابلہ دیگر مراحل کے
بہت دشوار تھا۔ اگرچہ غلامان سلاطین کی قوت میں زوال آ گیا تھا۔

لیکن وہ اس حالت میں بھی اپنے آقاؤں کو قتل کر دینے کی قدرت رکھتے تھے۔ سلطان سلیم نے ١٨٠٨ء میں ان جان نثاروں کی جماعت کو از سر نو ترتیب دینا چاہا لیکن انہیں کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ سلطان محمود دوئم نے اٹھارہ سال بعد اپنے عزیز کے قتل کا انتقام لیا۔ اور ١٨٢٦ء میں جان نثاروں کی بیخ کنی کی + پرانے طرز کے تعلیم یافتہ افراد اس تقلید میں اسلامی معاشرت کی مخالفت پاتے تھے چنانچہ مذہبی رنگ دیکر ان لوگوں نے بھی اس تحریک کی مخالفت کی + مذہبی احساسات کو بھڑکانا ہمیشہ سے آسان کام رہا ہے + اس لئے کسی تحریک کو مقبول عام بنانے کے لئے مذہب کی آڑ بہت کارگر ثابت ہوتی ہے + چنانچہ وہابیوں کی تحریک وسط و مشرق عرب میں اٹھارہویں صدی کے آخر ثلث میں ان بدعتوں کی روک تھام کے لئے شروع ہوئی + یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ترک سپاہی مغربی وردیاں پہنکر نئے اسلحہ سے نئی طرز کے مطابق فوجی قواعد سیکھ رہے تھے + پھر انیسویں صدی کے آخری نصف میں سنوسی فرقہ۔ افریقہ سے رونما ہوا۔ اور مہدیوں نے ١٨٨٣ء میں

سوڈان پر قبضہ کرلیا + یہ سب تحریکیں اسی تقلید کی مخالفت میں مختلف
جگہوں سے رونما ہورہی تھیں + لیکن باوجود ان مخالفتوں کے
سلطان محمود دوم نے ترکی میں اور محمد علی نے مصر میں مغربی فوجی تقلید
کو بہت رواج دیا + مصر میں نپولین کے فرانسیسی افسران فوج کو تعلیم
دے رہے تھے۔ اور ترکی میں اس مقصد کے لیئے جرمنی سپاہی
ملازم رکھے جاتے تھے۔ لیکن اس تدبیر اس قدر خرچ بڑھ گیا تھا
کہ اور شعبوں میں روپیہ کی کمی کے باعث ترقی مسدود ہو چکی تھی +
مغرب سے اختلاط و موانست کا سب سے اچھا موقع ۱۸۵۶ء
کے بعد ملا۔ کہ جب برطانیہ اور فرانس نے متفقہ طور پر ترکی کی حمایت
میں روس کو شکست دی۔ ترکی کو اس سے ایک تو کچھ عرصہ کے لیئے
روس کی پریشان کن حرکات سے نجات مل گئی۔ دوسرے
یورپ کے بہترین ترقی یافتہ ممالک کی زیر نگرانی ترکی مدبران کو اپنے
ملک کی بہبودی کے لیئے کام کرنے کا موقع ملا + اسی زمانہ میں مدحت
پاشا کو جو انتظامی قابلیت کے علاوہ آزادانہ تدبر بھی رکھتا تھا عروج
ہوا + مدحت نے اول یورپ میں دریائے ڈینوب کے جنوبی

علاقہ میں بحیثیت گورنر کے نام پیدا کیا۔ اور پھر عراق میں + ان دونوں
علاقوں میں جہاں کہ مدحت پاشا گورنر رہا تھا مختلف اقوام کے
باشندے آباد تھے اور ترکوں کی آبادی قلیل تھی۔ مدحت نے تمام
رعایا کو وفادار بنانے کے لئے مختلف ملتوں کے سربرآوردہ اشخاص
کی اعانت سے گورنری کا کام کیا + ان صوبوں میں مدرسہ جات
ثانویہ جابجا کھولے کہ جن میں بلاتخصیص مذہب وملت ہر جماعت کے
بچے تعلیم پاتے تھے۔ مدحت کی رائے یہ تھی کہ سلطنت عثمانیہ کے
عمدہ نظم ونسق کے لئے ایک ایسی مجلس آئینی یعنی پارلیمنٹ قائم ہونی
چاہئے کہ جس میں ہر ملت وقوم کے افراد اپنے نمایندے بھیج سکیں +
اس لحاظ سے مدحت پہلا ترک تھا کہ جس نے اس آزادانہ خیال کو
پیش کیا۔ اور مفتوح رعایا کو حکمرانوں کے برابر جگہ دینا چاہی لیکن
عیسائی رعایا اس سے بہت قبل مغربی نظام حکومت سے متاثر ہوکر
قومی احساس کو دل میں جگہ دے چکی تھی اور اب اس کو ایک ایسی
مختلف الملت پارلیمنٹ سے کوئی تسکین حاصل نہ ہو سکتی تھی ۱۸۶۷ء
میں صوبہ بلغاریہ نے جو مدحت کی بہترین کوششوں کا مرکز رہا تھا

بغاوت کا علم بلند کیا۔ اور نصف صدی بعد دوسرے صوبہ نے عراق کی قومی سلطنت کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ مدحت کی تمام زندگی کا بہترین سرمایہ جو ان دو صوبوں کی بہبودی کے لئے نذر ہو گیا تھا رائیگاں گیا۔ اس کے نظام پارلیمنٹ کو سلطان عبدالحمید نے یک قلم منسوخ کر کے شخصی اور جابرانہ حکومت کی تجدید کی کہ جس کا پہلا شکار مدحت پاشا خود ہوا۔ ان ہنگاموں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک اور جنگ چھڑ گئی جو بالآخر ترکی کی مزید تباہی کا باعث ہوئی۔ سلطنت کی مالی حالت بالکل ابتر ہو چکی تھی ۱۸۸۲ء میں بیرونی قرضخواہوں کی ایک کونسل منعقد ہوئی۔ اور قرضہ کی ادائیگی کے لئے چھ ذریعے اس کونسل کے سپرد کر دیئے گئے۔ چنانچہ مغربی تقلید کے لئے سلطنت عثمانیہ کی پہلی کوشش جس کا آغاز ۱۷۷۲ء کے بعد سے ہوا تھا۔ ایک صدی بعد نہایت تباہ کن نتائج پر ختم ہوئی مصر میں بھی اس کوشش کا یہی نتیجہ ہوا۔ انہیں وجوہات کی بنا پر نوجوان ترکوں کی انقلابی تحریک جس کے ذریعہ ۱۹۰۸ء میں انجمن اتحاد و ترقی نے عبدالحمید کے عہد حکومت کو ختم کیا تھا۔ ابتدا میں ناکام رہی۔ ہر چند کہ انقلاب پسند جماعت نے

مدحت پاشا کے اصول کے مطابق مختلف الملت پارلیمنٹ کی بنیاد ڈالی + لیکن عیسائی رعایا کہ جس کا مطمح نظر ایک آزاد قومی حکومت تھا اور جس میں قومی احساس روز بروز مستحکم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اب بھی مطمئن نہ ہوئی + یونانی۔ بلغاری اور رومانی قومیں اپنی آزاد سلطنتوں کا خاکہ کھینچ چکی تھیں اور یہ محال تھا کہ وہ مجتمع حالت میں ایک متحدہ سلطنت کی حامی اور مددگار ہوں + ادھر ترکوں میں خود قومیت کا احساس پیدا ہو چلا تھا۔ خاصکر ان افراد میں جنہوں جلاوطنی کا زمانہ پیرس میں گذارا تھا اور وہاں کے خیالات سے متاثر ہو گئے تھے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ سلطنت عثمانیہ کو ترکیت سے رنگ دیں + غیر ترکی اقوام کو اس خیال سے اور بھی وحشت ہوتی تھی۔ اس لئے سلطنت کی نازک حالت کو غنیمت جان کر انہوں نے اپنی قومی آزادی کے لئے مزید کوشش کی۔ اس میں قرب و جوار کی سلطنتیں بھی شریک کار ہو گئیں + چنانچہ آسٹریا ہنگری نے صوبجات بوسنیا و ہرزیگوینیا کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا + بلغاریہ نے بھی آزادی کا اعلان کر دیا + اٹلی نے شمالی افریقہ میں صوبجات طرابلس وغیرہ پر

قبضہ کرلیا + بلقان کی سلطنتوں نے بھی متفق ہوکر مزید صوبجات اپنے زیرنگیں کرلئے۔ صوبجات مغربی تھریس اور البانیہ بھی ہاتھ سے نکل گئے + لیکن ابھی اس سے زیادہ بربادی اور ناکامی کا سامنا باقی تھا جنگ یورپ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء میں ترکی کو بھی شامل ہونا پڑا۔ غالباً ترکوں کو امید تھی کہ فتح کی حالت میں کھوتے ہوئے صوبہ جات از سر نو قبضہ میں آجائیں گے۔ روس کو ترکی سے ہمیشہ عداوت رہی ہے۔ حالانکہ برطانیہ نے اس کے خلاف ترکی کو متعدد بار مدد دی تھی + لیکن جب جنگ یورپ میں برطانیہ نے روس کا ساتھ دیا تو وہی جذبات نفرت جو روسیوں کے خلاف تھے برطانیہ کے خلاف بھی برانگیختہ ہوگئے + ترکوں نے سلطان عبدالحمید کی پرانی ترکیب سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اس جنگ کو جہاد قرار دیکر تمام ممالک اسلامی سے معاونت چاہی۔

اسلامی دنیا کا بیشتر حصہ برطانیہ۔ فرانس۔ اور روس کے ماتحت تھا۔ اور ترکوں کو خیال تھا کہ اگر بیرونی مسلمانوں نے ساتھ دیا۔ توان جنگجو سلطنتوں کو عجب مشکل کا سامنا کرنا پڑیگا۔ لیکن جہاد کی تحریک ناکامیاب ثابت ہوئی + بیرونی مسلمانوں نے جنگ کے دوران میں ترکی کو کوئی عملی مدد نہ دی۔ اگرچہ صلحنامہ اکتوبر ۱۹۱۸ء کے بعد جب ترکی کا وجود ہی

معرضِ خطر میں تھا۔ مختلف ممالک کے مسلمانوں نے شورش شروع کر دی +
ترکوں نے ایک اور تحریک کو بھی جو بار آور نہ ہو سکی آزمایا + وہ
تحریک تورانی النسل اقوام کا متحد ہونا تھا۔ یعنی جتنی اقوام کہ ترکی
زبان بولتی ہیں۔ وہ مجتمع ہو کر متفقہ طور پر سلطنتِ عثمانیہ کے قیام کے
لئے کوشاں ہوں + ایسی اقوام زیادہ تر روس و ترکی کی سرحد
پر آباد ہیں۔ اور اگر ایسا اتحاد وقوع میں آتا تو نہ صرف مملکت روس
منتشر ہو جاتی بلکہ سلطنتِ عثمانیہ میں از سر نو قوت آجاتی + لیکن
سلطنتِ روس کا خود شیرازہ بکھر گیا۔ اور تورانی النسل روسی اقوام
کا اتحاد ترکی سے نہ ہو سکا بلکہ اس تحریک سے برطانیہ نے ایک
اور فائدہ اٹھایا۔ یعنی عربی النسل مسلمان جو ترکی کے ماتحت تھے۔
ان کو ترکی کی جانب سے بدظن کر دیا۔ برطانیہ کی یہ کوشش ۱۹۲۶ء
میں بار آور ہوئی۔ اور حجاز میں عربوں نے امریکہ کی رہنمائی میں
ترکوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا جنگ ۱۹۱۴-۱۹۱۸ء میں شرکت
کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ ترکی کے ہاتھ سے صوبجات عرب بالکل نکل گئے اور
مصر بھی اس کے زیر اثر نہ رہا + اب انجمن اتحاد ترقی بالکل تنگ

آ چکی تھی ۔ اور نہ صرف سلطنت کو خیر باد کہنے کے لئے تیار تھی ۔ بلکہ بیرونی اثر کے ماتحت رہنے کو بھی غنیمت جانتی تھی ۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ قسامِ ازل نے پہلے ہی سے ترکی کے لئے ایک اور زندگی مقسوم کر دی ہے +

باب چار

نوجوان ترک اور کمیٹی اتحاد و ترقی

ترکی کی عیسائی رعایا یورپ کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ اور اکثر ممالک کو اپنا معاون اور مددگار سمجھتی تھی۔ دور اندیش ترکی مدبرین بھی اس نکتہ سے واقف تھے۔ کہ عیسائی رعایا کے دلوں سے حکومت کا اثر و اقتدار روز بروز زائل ہو رہا ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ تشدّد اور سختی کے بجائے تلطّف اور مہربانی ہی زیادہ کارآمد ثابت ہوگی۔ کیونکہ اولاً تو غیر عیسائی ممالک کو دخل اندازی کا موقعہ نہ ملسکیگا دوئیم عیسائی رعایا حکومت کی دلنوازیوں سے متاثر ہو کر اپنی گذشتہ وفاداریوں پر قائم رہیگی۔ شاہ محمود دوئیم جو ۱۸۰۸ء میں تخت پر متمکن ہوا۔ اور اس کا جانشین عبدالمجید جس نے ۱۸۶۱ء میں وفات پائی دونوں اس راز سے بخوبی واقف تھے۔ خوش قسمتی سے ان کے مشیر کار

بھی صائب الرائے تھے۔ جن میں سے رشید پاشا کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ رشید پاشا ہی کے ایما سے ۱۸۳۹ء میں ایک فرمان شائع کیا گیا۔ جو "خط شریف گل خانہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس کو ترکی کا "میگنا چارٹا" تصور کرنا چاہیئے۔ اس فرمان کی رو سے متعدد اصلاحوں کا وعدہ کیا گیا۔ سلطان کی تمام رعایا خواہ مسلمان یا عیسائی سب کے جان و مال و عزت کی حفاظت کا یقین دلایا گیا تھا۔ بعد ازاں ۱۸۵۶ء میں جنگ کریمیا کے اختتام پر ایک اور فرمان موسومہ بہ "خط ہمایوں" مشتہر کیا گیا جس میں صاف الفاظ میں اعلان کر دیا گیا کہ قانون کی نظر میں مسلمان اور عیسائی ہمیشہ یکساں رہیں گے۔ مگر یہ سب کچھ بہت مفید ثابت نہ ہوا چونکہ عیسائی رعایا کی نگاہیں یورپ پر جم چکی تھیں۔

عبدالمجید کے انتقال کے بعد عبدالعزیز ۱۸۶۱ء میں تخت عثمانیہ کا مالک ہوا۔ اس وقت بھی رشید پاشا اور مدحت پاشا جیسے قابل وزرا مشیر سلطنت موجود تھے۔ تھوڑے عرصہ بعد محمود ندیم پاشا ۱۸۷۲ء میں وزیر اعظم مقرر ہوا۔ محمود ندیم نے قسطنطنیہ کی سیاسی حالت

ہی کو بدل دیا۔ چنانچہ جلد قصر شاہی کی حکومت قائم ہوگئی + اس سے قبل ملک کے جملہ انتظامات وزرا کی ایک مجلس کے ہاتھ میں تھے + جس کے دفتر کا نام "باب عالی" تھا۔ لیکن عبدالعزیز نے اس انتظام کو درہم برہم کر دیا۔ اور کل ملک کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں سنبھال لی + وزراء اس کے اشاروں پر ناچنے لگے۔ اور اس طرح قصر شاہی کی حکومت کا دور شروع ہوا + سلطان نے خزانہ پر قطعی قبضہ کر لیا + اور اس کو لاپرواہی کے ساتھ خرچ کرتا رہا + سلطان کی خودسری اور شخصی اقتدار اس درجہ بڑھ گیا کہ اس نے سرکاری مالیہ کا حساب دینے سے بھی انکار کر دیا۔ شاہی اللے تللوں میں خزانہ جلد ہی خالی ہوگیا + پایانِ کار سلطان نے یورپ کے مہاجنوں اور دیگر بیرونی حکومتوں سے بیدریغ قرض لینا شروع کر دیا اور ایسی سخت شرائط پر کہ جن کے باعث ملک کی خودمختاری بھی معرض خطر میں پڑ گئی +

ملک کی حالت روز بروز ابتر ہو رہی تھی۔ صوبجات ہرزیگوینیا اور بوسینیا میں ہل چل نظر آ رہی تھی + دول یورپ کی

مداخلت کا آئے دن انتظار ہو رہا تھا۔ مدحت پاشا سے خاموش رہکر ملک کی تباہی نہ دیکھی گئی۔ چنانچہ اس نے سلطان سے خلوت میں ملاقات کی۔ دو گھنٹہ تک خود سلطان اور وزیر اعظم کی بدنظمیوں کا حال بیان کیا۔ ملک کی ابتری اور تباہی کی وہ دردناک داستان سنائی کہ سلطان کانپ اٹھا۔ اس ملاقات کے بعد عبدالعزیز نے محمود ندیم کو برطرف کر دیا اور مدحت پاشا اور رشدی پاشا کو وزرار خاص مقرر کیا۔ مدحت پاشا کو نوجوان ترک اپنی تحریک کا "پہلا شہید" کہتے ہیں۔ اور اس کا یہ لقب بالکل بجا ہے۔ چونکہ مدحت جلد ہی حرم اور محل کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوا۔ محمود ندیم کا دوسرا دور پہلے سے بھی بدتر ثابت ہوا۔ لیکن اس مرتبہ صورت احتجاج مختلف تھی۔ یعنی ۲۲ مئی ۱۸۷۶ء کو چھ ہزار طلبہ نے سلطانی دفتر پر حملہ کیا۔ اور تقریباً ایک ہزار نوجوانوں نے شاہی محل کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان نے سراسیمگی کی حالت میں نوجوانوں کے مطالبہ کو منظور کر لیا۔ محمود ندیم برطرف ہوا۔ اور ملک کا انتظام مجلس وزرار کے سپرد کر دیا گیا۔ وزرار کو سلطان کی نیک نیتی کے بارے میں شکوک پیدا ہو چکے تھے۔

لہذا مجبور ہو کر انہوں نے سلطان کو معزول کر دینے کا ارادہ کیا شیخ الاسلام سے فتویٰ لیا گیا کہ بدنظمی کے جرم میں سلطان کے حقوق سلب کر لئے جائیں۔ ۳۰ مئی ۱۸۷۶ء کی شب کو افواج نے شاہی محل کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان کو اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ چنانچہ وہ معزول کیا گیا اور اس کی جگہ مراد پنجم تخت نشین ہوا +

مگر ترکوں کے نصیب میں ابھی امن و سکون نہ تھا۔ عبدالعزیز نے اپنی معزولی سے چار یوم بعد اس محل میں جہاں وہ رکھا گیا تھا یا تو خود کشی کر لی۔ یا کسی اور شخص نے اس کو ہلاک کر دیا + جب عبدالعزیز کی نعش نظر آئی۔ تو اس کا سرکیشین ایڈ ی کانگ حسن عفیف و غضب میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اور مدحت کے محل میں جا کر اس نے عونی پاشا اور رشید پاشا کو قتل کر دیا + اس درد انگیز سانحہ کا اثر نئے سلطان پر اس قدر ہوا کہ وہ معاً دیوانہ ہو گیا۔ یوں تخت عثمانیہ پھر خالی ہو گیا۔ نظر انتخاب سلطان مراد پنجم کے بھائی عبدالحمید پر پڑی ۱۸۷۶ء کے موسم سرما میں عبدالحمید نے زمام سلطنت عثمانیہ سنبھالی +

عبدالحمید کو اس وقت تک عنان حکومت ہاتھ میں لینے کی

اجازت نہیں دی گئی۔ جب تک اُسنے بذریعہ تحریر عدل وانصاف
کرنے اور آئینی حکومت قائم کرنے کا عہد و پیمان نہ کرلیا+ لیکن یہ عہد
استوار نہ تھا۔ چونکہ عبدالحمید دلمیں طے کرچکا تھا کہ خودمختار حکومت
ہی ترکی کے لیئے موزوں حکومت ہے اور اس خیال کا اظہار بھی
اس نے اپنے اردل کے ایک معروف جنرل سے تخت نشینی ہی کے
دن کیا تھا۔ مدحت پاشا وزیراعظم مقرر ہوا۔ اس نے ملک کی بہبودی
کے لیئے مختلف احکامات جاری کیئے۔ اور طرز حکومت کا اس طرح
آغاز کیا۔ کہ مختلف مذاہب اور نسلوں کے لوگ متفقہ طور پر حکومت
میں شریک ہوسکیں+ اس کے بعد مدحت نے علاقہ یورپ میں اس
بغاوت کی بیخ کنی کی جس کی وجہ سے جنگ چھڑ جانے کا اندیشہ تھا+
تعلیم یافتہ اشخاص مدحت سے بہت ہی انسیت رکھتے تھے۔ اور
اس کا اثر ایک وسیع طبقہ پر قائم ہوگیا تھا۔ ادھر عبدالحمید بھی غافل
نہ تھا۔ چنانچہ چار ماہ ہی گذرے تھے کہ اس نے آزادی کے سب
سے بڑے رکن پر وار کیا+ مدحت کو محل میں بلاکر اس کو جلاوطنی کا
حکم سنایا اور فی الفور اس کو ملک سے باہر نکال دیا+ رشدی پاشا

اور شیخ الاسلام کو بھی دور دراز مقامات میں جلاوطن کر دیا۔ جلاوطنی کے زمانے میں مدحت پاشا یورپ کے صدر مقاموں میں گھومتا رہا اور وہاں بھی وہ ترکی کی بہبود کیلئے تدابیر کرتا رہا + عبدالحمید نے یہ دیکھ کر کہ مدحت پاشا جلاوطنی کے زمانہ میں بھی اسی قدر مخدوش ثابت ہو رہا ہے۔ اُس کو دھوکے سے بلوا بھیجا۔ اور شام کی گورنری پر مامور کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد مدحت پر عبدالعزیز کے قتل کے لیے حکم دینے کا جھوٹا الزام لگایا گیا۔ لیکن چونکہ مدحت ملک میں بہت مقبول تھا۔ اور اس کا قتل کرنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ اس لئے اس کو عرب کے ایک قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ قید کی حالت میں مدحت پر ہر طرح کی سختیاں روا رکھی گئیں جن کو وہ تین سال تک برداشت کرتا رہا۔ آخر کار جلادوں نے اس کو مئی ۱۸۸۴ء میں گلا دبا کر ہلاک کر دیا۔ اور اس کا سر کاٹ کر شاہی محل کو بھیج دیا تاکہ مدحت کے ہلاک ہو جانے کے متعلق کوئی شبہ نہ رہے + اس کے بعد باب عالی کے سب اختیارات سلب کر لئے گئے۔ اور سلطان عبدالحمید مطلق العنانی سے حکومت کرنے لگا + مدحت کی زندگی کے پورے حالات اُس کے بیٹے علی حیدر مدحت نے لکھے ہیں اور

ملک و قوم کی ہوا خواہی میں مدحت کی جانبازانہ اور سرفروشانہ کوششوں کا صحیح مرقع کھینچا ہے۔ لیکن یہاں صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ یقیناً مدحت پاشا نئی تحریک کا پہلا شہید تھا۔ اور اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ کہ چند سال کے بعد نوجوان ترکوں نے عبدالحمید کو آئینی حکومت قائم کرنے پر مجبور کر دیا +

عبدالحمید شک و شبہ کا مجسمہ تھا۔ اور اس کو اپنی جان کا ہمیشہ خطرہ رہتا تھا۔ اس لیئے اُس نے ایک نہایت وسیع جاسوسی نظام قائم کیا۔ ذرا سے اشتباہ پر وہ فوراً مشتبہ شخص کو جلا وطن کر دیتا تھا + ترک جلا وطنوں کی تعداد روز بروز یورپ کے ممالک میں بڑھتی گئی باغیانہ خیالات کو روکنے کے لیئے اس نے بیرونی تصانیف کا داخلہ ملک میں بند کر دیا + لیکن ترکی ادب خود انقلابی جوش سے متاثر ہو چکا تھا + اس رنگ میں ایک ترک مصنف کمال بے نے نہایت شہرت حاصل کی + اس کی تصانیف ڈرامہ۔ نثر۔ فلسفہ اور ناول جو یورپ میں شائع ہوئیں۔ ترکی میں ممنوع قرار دی گئی تھیں۔ لیکن اس ممانعت کے باعث عوام کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔ اور کمال بے کی کتابیں

بیحد شوق کے ساتھ پڑھی جانے لگیں۔ فوج کو درست رکھنے کے لئے
عبدالحمید مجبور تھا۔ کہ ترکی افسران کو یورپ میں تعلیم کے لئے بھیجے۔
یہ نوجوان افسر یورپ کے نئے خیالات سے متاثر ہو کر لوٹتے تھے۔ اور
اس طرح سے انقلابی خیالات میں برابر زیادتی ہو رہی تھی۔ علاوہ
ازیں جس قدر جلاوطنوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی قدر ان میں
باہمی اتحاد بھی بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ ان کی ایک انجمن "نوجوان ترک پارٹی"
قائم ہو گئی۔ شروع شروع میں ان کو "پاگل باغی" کہا جاتا تھا۔ اور
ان سے کسی قسم کا حکومت کو خدشہ نہ تھا۔ یہ نوجوان ترک "اتحاد اسلامی"
پر اعتماد نہ رکھتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ ہم عثمانی ترک ایک ایسی قوم
سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہ جنہیں اس بات کو سمجھنے کا مادہ موجود ہے
کہ اتحاد اسلامی کے اصول پر عمل کرنا ہمارے بہترین مفاد کے منافی نتیجہ
پیدا کریگا۔ دراصل نوجوان ترکوں کی تحریک محض قومی تھی۔ اور اتحاد
اسلامی کے اصول کے برعکس۔ یہ وہی خیال ہے کہ جس پر اب مصطفیٰ کمال
کی قوم پسند جماعت بھی عمل کر رہی ہے۔ نوجوان ترکوں کا مدعا تھا۔ کہ ترکی
رعایا مسلم اور غیر مسلم کو ایک قوم بنا کر حکومت کی بنیاد کو مستحکم کر دیں

کہ بیرونی خطرات سے نجات پائیں +

ترک جلاوطنوں کی بیشتر تعداد لندن اور پیرس میں پناہ گزیں تھی + جب ان کی تعداد میں کافی اضافہ ہوگیا ۔ تو انجمن کی صورت میں وہ نوجوان ترک ،، کہلانے لگے + اپنے خیالات کے اظہار کے لئے انہوں نے ایک اخبار موسومہ بہ ،، حُریت ،، بھی جاری کیا جس کا داخلہ قسطنطنیہ میں بہت جلد ممنوع قرار دیا گیا + مگر پھر بھی وہ اخبار کسی نہ کسی طرح ملک میں داخل ہوتا رہا + عبدالحمید نے ۱۸۷۸ء میں پارلیمنٹ کو توڑ دیا + اور اس طرح نوجوان ترک روئے زمین پر پھیر منتشر ہو گئے جو ترکی میں رہے وہ اسیر کر لئے گئے + چنانچہ آٹھ نو سال تک نوجوان ترکوں کا نام بھی سننے میں نہ آتا تھا + اور اگر کہیں ان کی جماعت کی موجودگی کا پتہ لگ جاتا تھا ۔ تو اس کو بالکل بے بس اور لاچار سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا لیکن خفیہ طریقہ پر نوجوان ترک یورپ کے مختلف مقامات پر اپنی گروہ بندی میں مصروف رہے ۔ جنیوا میں ۱۸۹۱ء میں ترکوں نے پہلے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی ۔ اور پھر "عثمانیہ کمیٹی اتحاد و ترقی ،، قائم کی + وہ ل یورپ ترکی کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے در پے

تھے۔ اس امر کو مدِ نظر رکھ کر نوجوان ترکوں نے اپنا اولین مقصد سلطنتِ عثمانیہ کو سالم اور برقرار رکھنا قرار دیا۔ اور اس لئے وہ کسی غیر سلطنت کا ترکی کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا بھی گوارہ نہ کر سکتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد کمیٹی نے اپنا مرکزی مقام جنیوا سے پیرس کو منتقل کر دیا۔ لیکن قصرِ شاہی کی ریشہ دوانیوں سے نوجوان ترک یہاں بھی محفوظ نہ تھے۔ محل کے جاسوسوں نے پیرس تک میں رشوت اور لالچ کی گرم بازاری کر رکھی تھی۔ چند ممبران جن کی آنکھیں اعلیٰ منصبوں اور کثیر انعام کے وعدوں سے خیرہ ہو چکی تھیں ایسے کم ظرف ثابت ہوئے۔ کہ انہوں نے اپنے نام جاسوسوں کے زمرہ میں لکھا دئے۔ پیرس کی کمیٹی احمد رضا بے کی سرکردگی میں کام کر رہی تھی۔ جو اٹھارہ سال تک جلاوطن رہا تھا۔ احمد رضا بے ۱۹۰۲ء میں لندن گیا۔ اور اس نے ایک تقریر کرتے ہوئے صاف الفاظ میں بیان کیا۔ کہ نوجوان ترک ہر بیرونی مداخلت کو نہایت شبہ سے دیکھتے ہیں۔ اور ارمینیا اور مقدونیا کی ترکی عیسائی آبادی میں جو کھلبلی مچی ہوئی ہے

اس کا ذمہ دار اُنہیں بیرونی سلطنتوں کو سمجھتے ہیں + جو خواہ مخواہ
ترکی کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کر رہی ہیں +
احمد رضا بے نے اعلان کر دیا کہ اس کی جماعت ترکی میں ایک ایسی
حکومت قائم کرنا چاہتی ہے کہ جسمیں ملک کی تمام قومیں اور مختلف
مذاہب کے افراد بلا کسی استثنا کے مساوی حقوق کے ساتھ
شرکت کر سکیں + چنانچہ اس مدعا کے لئے نوجوان ترکوں نے
غیر مسلم عثمانی انجمنوں کو اپنا ساتھ دینے کے لئے ابھارنا شروع
کیا۔ اس طرح سب سے پہلے ارمینیاں کی کمیٹیاں اُن کی ہمخیال
وہمنوا ہو گئیں اور ۱۹۰۳ء میں ان کے درمیان رابطہ اتحاد
قائم ہو گیا + اس کے بعد نوجوان ترکوں نے ارمینیا کی عیسائی
رعایا سے درخواست کی کہ آئندہ سے وہ بیرونی امداد کے واسطے
ملتجی ہونا چھوڑ دیں۔ کسی غیر سلطنت کے روبرو دستِ طلب نہ
بڑھائیں اور اپنی شریک اسلامی رعایا کی استعانت پر کامل
اعتماد کریں تاکہ آئندہ کسی خونریزی کی نوبت نہ آئے + مقدونیہ
کی کمیٹیوں کے ساتھ بھی اسی طرح کے عہد و پیمان ہو گئے۔ چنانچہ

اس تمام جد و جہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۲ء میں ترک باغیوں کی ایک عظیم الشان کانفرنس پیرس میں منعقد ہوئی جس میں عثمانی کمیٹی اتحاد و ترقی کے ارکان کے علاوہ اہل ارمینیا - بلغاریہ - عرب - البانیہ اور یہودیوں کی کمیٹیوں کے نمائندے باطمینان خاطر شامل ہوئے - باتفاق رائے حسب ذیل اصول قرار پایا - کہ "سلطان عبد الحمید کو تخت سے معزول کیا جائے - اور سلطنت عثمانیہ کو سالم و برقرار رکھا جائے مختلف اقوام اور مذہب کے افراد کو مساوی حقوق دیئے جائیں - اور مدحت پاشا کے طرز حکومت کے مطابق پارلیمنٹ وسررشتہ حکومت قائم کئے جائیں"۔

سالونیکا ایک آباد شہر ہے - اور اس میں ترک - یونانی - یہودی بلغاری وغیرہ متعدد اقوام کے افراد آباد تھے - اور کئی قسم کی زبانیں رائج تھیں چنانچہ وہاں بھیس بدلنا اور جاسوسوں کی نظروں سے بچے رہنا چنداں مشکل امر نہ تھا - اس بنا پر عثمانیہ کمیٹی اتحاد و ترقی نے اس شہر کو خفیہ انجمن کا مرکزی مقام منتخب کیا - اور ۱۹۰۶ء کے موسم گرما میں وہاں ایک خفیہ انجمن قائم ہوئی - جو تھوڑے عرصہ بعد پیرس والی

کمیٹی سے ملحق کردیگی + اس خفیہ انجمن میں نئے ممبروں کی شرکت بڑی چھان بین اور احتیاط کے ساتھ کی جاتی تھی ۔ اور پھر بھی مدتوں تک ایک نئے ممبر کو سوائے چند ارکان کے اوروں کا نام بھی نہ معلوم ہوتا تھا + شرکت کے وقت نہایت اہم حلف اٹھانا پڑتا تھا ۔ اور ہمیشہ کے لئے وفاداری کا وعدہ کرنا ہوتا تھا ۔ اس انجمن کے ارکان سپاہیوں ۔ فوجی افسروں اور شہری آبادی میں باغیانہ خیالات پھیلاتے پھرتے تھے ۔ ان کو تلقین کرتے تھے کہ حکومت کو ٹیکس ادا نہ کریں اور عام بغاوت کے لئے تیار ہو جائیں + اس سلسلہ میں ترکی مستورات نے بھی کام کیا + چونکہ ملکی دستور کے مطابق ترکی خواتین کا بہت احترام کیا جاتا تھا ۔ اور بغیر کسی سنگین الزام کے کوئی پولیس افسر کسی خاتون کے کمرہ کی تلاشی بھی نہ لے سکتا تھا اس لئے خفیہ مراسلات اور بہت سے مشکل کام مستورات ہی کے ذریعہ سرانجام پاتے تھے + عثمانیہ عساکر کے نزدیک سلطان محض بادشاہی نہ تھا ۔ بلکہ مذہبی پیشوا کا بھی درجہ رکھتا تھا + چنانچہ اُن میں باغیانہ خیالات کا پھیلانا عام طور پر محال سمجھا جاتا تھا

لیکن اس خفیہ جماعت کے افراد نے انہیں یقین دلایا کہ سلطان عبدالحمید ایک ظالم حکمران ہے۔ اور از روئے مذہب ظالم کا نام مٹانا عین ثواب ہے + مثال کے طور پر عبدالعزیز کی معزولی کے متعلق شیخ الاسلام کے فتوٰی کو پیش کیا جاتا تھا + اس زمانے کے نوجوان ترک عبدالحمید کو بھی اسی نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ خلیل خالد بے نے جو ایک مشہور مدبّر گذرا ہے۔ اپنے روزنامچہ میں عبدالحمید کے متعلق لکھا کہ "وہ اسلام کا بدترین دشمن ہے۔ اور اس کی سب کارروائیاں اسلامی قانون اور مذہبی اصول کے بالکل متضاد ہیں" +

خفیہ کمیٹی کو اپنے اصولوں کے بسرعت پھیلانے میں انتہا درجہ کی کامیابی ہو رہی تھی۔ نوجوان ترکوں کا خیال تھا کہ عام بغاوت ۱۹۰۹ء کے موسم سرما میں کی جائے۔ لیکن ایک طرف تو قصر شاہی کی جانب سے ان کی مخالفت میں زیادہ سختی کی جا رہی تھی۔ دوسری طرف مقدونیہ میں ہلچل کے باعث بیرونی ممالک خاصکر برطانیہ اور روس کی مداخلت کا اندیشہ ہر لحظہ بڑھ

رہا تھا + اس لیئے کمیٹی اتحاد ترقی کے لیئے سوائے اس کے اور
کوئی چارہ کار ہی نہ رہا کہ اپنی ہستی اور اپنے رسُوخ کے راز کو
فوراً طشت از بام کردیں + چنانچہ وقت مقررہ سے ایک سال
قبل یعنی ۱۹۰۸ء میں ایک اعلان تیار کیا گیا ۔ اور اس کی نقلیں تمام
یورپ کی حکومتوں کے پاس روانہ کردی گئیں + اعلان میں ظاہر
کردیا گیا تھا کہ مقدونیہ ترکی کا حصہ ہے ۔ اور ممبران کمیٹی اتحاد و ترقی
مقدونیہ کی حفاظت کے لیئے جان تک قربان کردینے کے لیئے تیار
ہیں + بیرونی سلطنتوں کو آگاہ کیا گیا کہ وہ مداخلت کے خیال
سے باز آئیں + اسی اعلان کے آخر میں درج تھا کہ "ہم مسلمان
اور عیسائی جو عثمانی کمیٹی اتحاد و ترقی کے ماتحت یک جان ہو چکے
ہیں قومی یا مذہبی جوش یا تعصب سے بالکل آزاد ہیں ۔ اور
اپنے ملک کو غیروں کی مداخلت سے بچانیکے واسطے ساعی و
سرگرم ہیں + ہم موجودہ حکومت کی دستبرد سے اپنی ذاتی اور
سیاسی آزادی کو مامون رکھنا چاہتے ہیں + ہم دعوے سے کہتے
ہیں کہ انگلستان اور روس کی مجوزہ تدابیر مقدونیہ کو سلطنتِ عثمانیہ

سے علیحدہ کرادیں گی + جو ہم کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے ''+ اسی اعلان کے شائع کرنے کے تقریباً ایک ہفتہ بعد یعنی دنٹل جون ۱۹۱۸ء کو بمقام ریوال شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم اور زار روس کی متفقہ تجاویز دیگر دول یورپ کے پاس روانہ کردی گئیں +

نوجوان ترکوں نے مزید تعویق کو اپنے لئے نقصان دہ تصور کرتے ہوئے فوراً عملی تدابیر شروع کیں +

وقت مقررہ سے ایک سال قبل یعنی ۲۸ جولائی ۱۹۰۸ء کو میجر نیازی بے نے بمقام رسنا سب سے پہلے قدم اٹھایا۔ اور علانیہ سلطان کی اطاعت سے منحرف ہوگیا + مسلمان و دیگر سپاہ کو جو اُس کے زیر کمان تھی۔ لیکر پہاڑوں میں بھاگ گیا + اُس نے اپنے اعلان بغاوت میں تمام مُحبّانِ وطن کو دعوت دی۔ کہ گورنمنٹ کے تباہ کرنے میں اس کے ساتھ شریک ہوجائیں + نیازی بے خود البانیہ کا باشندہ تھا اور ایک زراعت پیشہ مسلمان خاندان کا فرد تھا + نیازی بے رسنا ہی میں پیدا ہوا تھا۔ اور قرب وجوار کے علاقوں سے بخوبی واقف تھا۔ اور وہاں کے باشندوں میں

اس کا رسوخ اور اقتدار بھی تھا + نیازی بے کو اس کے ہمعصر انور بے
نے کمیٹی میں داخل کیا تھا مگر جلد یہ خود ہی کمیٹی کا روح رواں
بن گیا +

علم بغاوت بلند کرنے سے قبل ۲۸؍جون ۱۹۰۸ء کو ایک ممبر
حاجی آغا کے مکان پہ ایک جلسہ میں نیازی بے نے نہایت پُرشور
تقریر کرتے ہوئے کہا "ہمارے اندرونی معاملات میں یورپ
والوں کی مداخلت محض عیسائیوں کی شکایت کی وجہ سے ہونے
والی ہے۔ حالانکہ خود عیسائی حکومت کے زمانہ میں ان پر اس قدر
مصیبتیں نازل نہیں ہوئیں جسقدر کہ ہم مسلمان ان کے مورد
ہوتے رہے ہیں + پس ہم اسی انقلاب سے دنیا میں عملی طور پر
ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آبائی ملک کی حکومت میں عیسائی ہمارے
بھائی ہیں۔ ہم ان کو مساوی سمجھتے ہیں۔ اور یہ کہ ہمیں ان کی عزت
اور حریت کا ایسا ہی خیال ہے۔ جیسا کہ ہمیں اپنی آبرو کا" اس
تقریر کے اختتام پر نیازی بے نے کہا "میں اپنی بیوی کو جس کی
حال ہی میں شادی ہوئی ہے اور اپنی ہمشیرہ کو معہ اس کے بچوں

کے مناسترروانہ کرتا ہوں - اور چونکہ بجز میرے ان کا کوئی نگراں نہیں لہذا میرے رشتہ دار ان کی پرورش کرینگے اور میں ان سب عزیزوں کو سرِدست ہمیشہ کے لئے خیر باد کہتا ہوں - کیا آپ میں سے کوئی صاحب دل وجان سے میرا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں؟" اس وقت کمیٹی کے تقریباً پچاس ممبر موجود تھے - اور سب نے متفق ہوکر جواب دیا کہ "ہم آپ کے ساتھ جان دینا باعث اعزاز اور خوش قسمتی سمجھتے ہیں اور سب تیار ہیں" چنانچہ اس جلسہ میں آئندہ جمعہ یعنی ۳ جولائی بغاوت کے لئے مقرر کیا گیا +

کمیٹی اتحاد و ترقی جاسوسوں کی حرکات سے پریشان ہو رہی تھی - جاسوس چشم ہوس کھولے ہوئے قصر یلدز کے مکیں کے اشارہ پر سرگرم تخریب جمہور تھے - چنانچہ کمیٹی نے محل والوں میں سے چند کو منتخب کرکے اُن کے خلاف ہلاکت کا فتویٰ دیدیا - اور اپنے رضاکاروں کو اس کام کے لئے نامزد کردیا + اس طرح ۷ جولائی کو جنرل شمس پاشا روز روشن میں قتل کردیا گیا + کرنل ناظر بے جو باغیوں کی مخالفت میں بہت پیش پیش تھا - زخمی ہوکر بھاگ گیا + سلطان کی

جانب سے لالچ اور منصبوں کے وعدہ دیکر باغیوں کو لوٹنے کی ترغیب بھی دی جا رہی تھی۔ مدحت پاشا کے وقت سے لیکر اس وقت تک کئی اشخاص۔ اس چال سے محفوظ مقامات سے نکال کر مذبح میں لائے جا چکے تھے۔ مگر انور بے نیازی بے اور ان کے رفیقوں نے دوسروں کی عبرتناک حالت سے سبق سیکھ کر سلطان کی دعوتوں کو قبول نہ کیا۔ عدم تعمیل احکام شاہی کے نتائج سے ڈر کر پہاڑی علاقوں میں چلے گئے۔ اور علانیہ علم بغاوت بلند کرنے لگے۔ نیازی بے کو ہر جگہ کامیابی نصیب ہو رہی تھی۔ اس کے ہمراہیوں کا دیہاتی خیر مقدم کرتے تھے۔ اور انہیں ترکی کے نجات دلانے والے سمجھتے تھے۔ وہ اُن اشیا کی جو نیازی بے کے لشکر کو بہم پہنچاتے قیمت بھی نہ لینا چاہتے تھے مگر نیازی بے نے اُس کو روا نہ رکھا۔ وہ یا تو نقد ادا کر دیتا تھا یا اسکی رسید دیکر کہتا تھا کہ یہ رقم سرکاری مالیہ میں مجرا کر لی جائے گی اور اس کے ساتھ مقامی تحصیلداروں اور دیگر اہلکاروں کے نام نوٹس بھیج دیتا تھا کہ جو شخص اِن (رسیدوں) کو ادائیگی مالیہ کا جزو سمجھ کر مجرا نہیں دے گا۔ وہ پھانسی کی سزا کا مستوجب

ہوگا۔ مینجر انور بے جو نہایت معروف افسر تھا۔ نیازی بے کے مانند فوجی ملازمت چھوڑ کر اپنے فدائیوں کے ساتھ دوسرے علاقوں میں اسی طرح کام کر رہا تھا اور اس کو بھی ہر جگہ کامیابی ہو رہی تھی۔ اہل البانیہ کمیٹی اتحاد و ترقی کی علانیہ حمایت اور مدد کر رہے تھے اور بلغاریوں نے بھی ان کی جانب رفیقانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔

حکومت تقریباً عاجز ہو چکی تھی اور آخری کوشش کر رہی تھی کہ بغاوت فرو ہو جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے اناطولیہ سے افواج روانہ کی گئیں۔ لیکن قصر شاہی نے اپنی سازشوں کو بھی برقرار رکھا اور یونانیوں سے خفیہ طور پر کمیٹی کے خلاف سازشیں کیں کہ نیازی بے اور اس کے رفیقوں کو گرفتار کرا دیں۔ کمیٹی اتحاد و ترقی کو بھی اس کا علم ہو گیا اور اس نے ایک اعلان یونانیوں کے پاس روانہ کیا جس میں ان سے درخواست کی کہ وہ ان کے خلاف کسی سازش میں شریک نہ ہوں۔ اور یہ کہ اگر وہ ہوئے تو ان کو شدید تکالیف کا سامنا کرنا پڑیگا۔ جولائی کے تیسرے ہفتہ تک کمیٹی کو نہایت شاندار کامیابی ہو چکی تھی۔ حکومت کا اقتدار تین ولایتوں پر برائے نام رہگیا تھا۔ کمیٹی کے خلاف

جن فوجوں کو روانہ کیا جاتا تھا۔ ان کے نوجوان یا تو کمیٹی کے ساتھ ملجاتے یا حکومت کی حمایت سے منحرف ہوجاتے تھے۔ جنرل عثمان پاشا مناستر میں باغیوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا لیکن اپنی فوج کی حالت دیکھ کر خاموش پڑا رہا۔ ادھر کمیٹی کے کارکن بھی سمجھتے تھے کہ آخری مرحلہ درپیش ہے۔ نیازی بے وغیرہ نے فیصلہ کیا کہ مزید توقف کرنا بیکار ہے۔ اس لئے ایسے فی الفور آئینی حکومت کا اعلان کردیا جائے۔ اور سلطان عبدالحمید کو بھی آگاہ کردیا جائے۔ کہ یا تو وہ آئینی حکومت کو تسلیم کرلیں یا تخت سے دست بردار ہوجائیں۔ ورنہ خونریز خانہ جنگی کا احتمال ہوگا۔ کمیٹی نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے مناستر پر قبضہ کیا جائے جو حکومت کی فوجی طاقت کا صدر مقام تھا چنانچہ دو ہزار نوجوان روانہ کئے گئے۔ مخالف افسران کو قید کرلیا گیا اور جنرل عثمان پاشا کو بھی حراست میں لیکر رسنا بھیج دیا گیا۔ اس طرح ۲۳ جولائی ۱۹۰۸ء کو مقدونیہ اور البانیہ والوں نے شخصی حکومت کا طوق اپنی گردنوں سے اتار پھینکا۔ ہر طرف سے توپوں کی گونج میں آزادی کا اعلان ہونے لگا۔ نیازی اور اس کے رفیقوں

نے حلف اٹھایا تھا۔ کہ جب تک کامیابی نہ ہوگی۔ اپنے گھروں کو زندہ نہ لوٹیں گے۔ اب وہ سب شاداں و فرحاں رسنا واپس ہو رہے تھے۔ مسلمان عیسائی وغیرہ سب اقوام کے افراد رسنا میں جمع ہوکر نصرت اور فتح کے شادیانے بجا رہے تھے۔ بیشمار پھریرے جن پر آزادی مساوات۔ اخوت۔ وغیرہ لکھا ہوا تھا۔ ہوا میں لہرا رہے تھے۔ جمہور نے بازاروں اور کوچوں میں "قوم زندہ باد" اور "کمیٹی زندہ باد" کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔

مناستر پر قبضہ ہو جانے کے بعد کمیٹی کی خواہش تھی کہ سلطان عبدالحمید کو اصلی واقعات سے جلد از جلد آگاہ کر دیا جائے۔ چنانچہ حلمی پاشا جو کہ مناستر کا گورنر تھا۔ اس کام کے لئے تجویز کیا گیا۔ اور اس کو متنبہ کر دیا گیا کہ اگر ذرا بھی توقف ہوا۔ تو اس کی جان کی خیر نہیں۔ چنانچہ حلمی پاشا نے تمام واقعات کی اطلاع قصر شاہی میں بالتفصیل پہنچا دی۔ حلمی پاشا ۲۳ جولائی کو علانیہ باغیوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اور اسی دن صبح کو کمیٹی کی جانب سے سلطان کو بذریعہ تار مطلع کیا گیا۔ کہ اگر چوبیس گھنٹہ کے اندر آئینی حکومت قائم نہ کردی گئی تو

قسطنطنیہ پر چڑھائی کر دیجائیگی۔ اسی شب پرانی حکومت کے تحت میں
آخری شاہی کونسل منعقد ہوئی۔ جس میں بہت دیر تک اضطراب کے
ساتھ بحث ہوتی رہی۔ بحث نے اس قدر طول کھینچا کہ تمام شب گذر
نے پر بھی کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ آخر کار دربار کا پُرانا عرب نجومی ابوالہدیٰ
پالکی میں لایا گیا۔ اور اس نے جو کچھ وزرار کے دل میں تھا صاف
صاف کہدیا۔ وزراء میں سے خوف کے مارے کسی کی ہمت نہ پڑی
تھی کہ کھلم کھلا اپنی رائے کا اظہار کرے۔ اس لئے بطور
السکاموشی نیم رضا انہوں نے اپنی گردنیں نیچی کرلیں۔ چنانچہ اس فیصلہ
کی اطلاع سلطان کو دیدی گئی۔ جو پہلے ہی سے اصل حالت کا انداز
کرچکا تھا۔ دوسرے دن ۲۴ر جولائی کی صبح کو عثمانیہ سلطنت کے
ہر حصہ میں بذریعہ تار کمیٹی اتحاد کے مطالبات کی منظوری کی خوشخبری
پھیل گئی۔ اور ہر جگہ شادیانے بجنے لگے۔ شاہی فرمان جاری کرنے
اور حلف لینے میں کس قدر دیری ہوئی۔ لیکن پھر قصر شاہی پر چڑھائی
کی دھمکی دی گئی۔ اور یہ دونوں باتیں بھی عمل میں آگئیں۔
اس کامیاب انقلاب کے بعد جلاوطنوں نے جوق جوق

اپنے وطن واپس آنا شروع کیا۔ اور نئی حکومت کی جانب سے ملک
کی بہبودی کے لئے کوششیں شروع ہوگئیں + آمد و رفت کے ذرائع
میں توسیع کی گئی اور تجارت اور تعلیم کی طرف بھی توجہ مبذول
کی گئی + شروع شروع میں ہر شخص کمیٹی کی اطاعت اپنا فرض سمجھتا رہا۔
اور ظاہرا ہر جگہ کامیابی کے آثار نمایاں ہوتے رہے لیکن چار ماہ
بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ یونانی آبادی نے فتنہ وفساد برپا کردیا
اول تو یونانیوں نے بلغاریوں کے خلاف دست درازیاں شروع کیں
اور اُن کے مذہبی پادریوں کو ستانا شروع کیا + پھر عام انتخاب کے
موقع پر انہیں کی بدولت فساد برپا ہوئے + بالآخر سمرنا کی مسلح جماعتوں
میں شورش پیدا کرنے کے یہی بانی مبانی تھے + دراصل سب سے پہلے
نوجوان ترکوں کے انتظام پر حرف لانے والی یہی جماعت تھی اُدھر
سلطان اور بادشاہ پسند جماعت نے بھی اس موقع کو غنیمت جانا
اور کمیٹی کی مخالفت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا + ایک نئی انجمن جمعیت
محمدیہ نے مسلمان آبادی کے جذبات پر غلبہ پالیا + ان کے نزدیک
کمیٹی اتحاد و ترقی کے افراد اور فواج کے افسران قرآنی ہدایت

کی پیروی نہ کر رہے تھے + چنانچہ جمعیت محمدیہ کمیٹی کی سخت دشمن ہو گئی۔
اور اس کی بدولت تمام مسلمان بھی کمیٹی سے منحرف ہو گئے +
بمشکل آٹھ ماہ گذرے تھے کہ حالت دگرگوں ہو گئی +
قسطنطنیہ میں ۱۳ اپریل ۱۹۰۹ء کو پرانی حکومت کا اقتدار پھر جم گیا
اور کمیٹی کے ممبران اپنی جان بچانے کے لئے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے +
سلطان عبدالحمید نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ۱۳ اپریل
کی شام کو ان نئے باغیوں پر مراحم خسروانہ فرماتے ہوئے "بچوں" کے
لقب سے خطاب کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ ازسرنو شورش ہونے
لگی + پھر عیسائیوں کی خونریزی اور خانہ جنگی کی گرم بازاری شروع
ہو گئی + حتیٰ کہ بیرونی مداخلت کا خوف لاحق ہو گیا + اس فتنہ و فساد
کے دوران میں بلغاریہ نے اپنی آزادی حاصل کر لی لیکن سالونیکا
میں پھر کمیٹی اتحاد و ترقی نے اپنی ترتیت کی انور لے اور حتیٰ بے
برلن اور وائنا سے عین موقع پر واپس آ گئے۔ اور نیازی بے سے
جا ملے + سالونیکا سے پھر قسطنطنیہ پر چڑھائی کی گئی۔ شاہی محل کا
محاصرہ کر لیا گیا + اور شیخ الاسلام کے فتوی کی رو سے

عبدالحمید کو ۲۷ اپریل ۱۹۰۹ء کو معزول کر دیا گیا + اس کی جگہ اس کے
بھائی رشیدی آفندی کو جو محل دولمہ باغچہ میں قید تھا تخت پر بٹھا
گیا اور عبدالحمید کو رشید کی جگہ دولمہ باغچہ میں نظر بند کر دیا گیا +
جو کچھ ابھی تک لکھا گیا + وہ انقلاب کا محض ایک پہلو ہے +
اور اس میں ظاہرا نوجوان ترکوں کی کامیابی نظر آتی ہے + اس
تحریک کی اصل وجہ یہ تھی کہ نوجوان ترک سلطنتِ عثمانیہ کو سالم
اور برقرار رکھنا چاہتے تھے + اور بالخصوص مقدونیہ کو جسمیں ترکی
آبادی بہت کم تھی نہ چھوڑنا چاہتے تھے + مقدونیہ کے چاروں
طرف آزاد عیسائی سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں + جو کسی زمانہ میں مملکت
عثمانیہ میں شامل تھیں اور انمیں سے ہر ایک کی کوشش تھی - کہ
مقدونیہ کو اپنی حدود میں شامل کر لے + چنانچہ مقدونیہ اور اس
کے قرب میں ہر جگہ شورش برپا رہتی تھی جس کے باعث حکومت عثمانیہ
کو بے انتہا مصارف برداشت کرنے پڑتے تھے + نوجوان ترک
اس علاقہ پر تسلط - برقرار رکھنا چاہتے تھے اور اس مُدعا کیلئے
انہوں نے عیسائی رعایا سے سلطان عبدالحمید کی حکومت سے

خلاف ایک معاہدہ کرلیا تھا۔ اسی ایفائے عہد کے لئے نوجوان ترکوں نے ۱۹۰۸ء میں قبل از وقت ہی انقلابی تحریک شروع کردی تھی۔ عیسائی رعایا سے یہ اتحاد نوجوان ترکوں کی نیک نیتی پر مبنی تھا، جس کے لئے یہ ثبوت کافی ہے کہ انقلاب کے بعد انہوں نے مدحت پاشا کے آئین کے مطابق دستوری حکومت قائم کی اور عیسائی رعایا کو مساوی حقوق دئے۔ ان مراعات کے بدلے نوجوان ترک یہ چاہتے تھے کہ عیسائی اقوام سلطنتِ عثمانیہ کی خیرخواہ اور وفادار رعایا رہیں۔ اور بیرونی عیسائی سلطنتوں سے کبھی امداد کے متوقع نہ ہوں لیکن کمیٹی اتحاد و ترقی کی سب سے بڑی کوتاہ نظری یہی تھی۔ ان کی تحریک کی بنیاد ایک ایسے اصول پر مبنی تھی۔ جو مدت سے باطل ہو چکا تھا لیکن جس کو وہ اس وقت تک نہ سمجھ سکے تھے مغربی ممالک میں "قومیت کا خیال روز بروز مستحکم ہو رہا تھا اور ہر قوم آزاد ہو کر علیحدہ سلطنت قائم کرنا چاہتی تھی۔ تاکہ اس سلطنت کے تمام افراد ہم قوم ہونیکے باعث یکجہتی سے ملکی نشوونما کیلئے کام کرسکیں۔ مشرق قریب کی عیسائی قوموں پر بھی اس خیال کا

بہت گہرا اثر پڑ چکا تھا۔ اور اپنے مستقبل کے لئے اسی اصول پر کاربند ہونا چاہتی تھیں۔ متعدد عیسائی صوبہ جات عثمانیہ مملکت سے نکل کر آزاد سلطنتیں بن چکے تھے اور باقی ماندہ صوبجات بھی اسی مقصد کے خواہاں تھے۔ چنانچہ یہ ظاہر ہے۔ کہ نوجوان ترک ان وجوہات کی بنا پر اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔ لیکن وہ اس حقیقت کے سمجھنے سے قاصر تھے۔

سلطان عبدالحمید کے استبداد نے عیسائی رعایا کو برگشتہ کر دیا تھا۔ چنانچہ جب نوجوان ترکوں نے اپنی آواز عبدالحمید کی حکومت کے خلاف بلند کی تو عیسائی رعایا بھی لبیک کہکر ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔ نوجوان ترکوں کی تحریک کے دو قسم جز تھے۔

ان کا اولین مقصد سلطنت کو سالم اور برقرار رکھنا تھا۔ اور چونکہ ان کی رائے میں عبدالحمید کی طرز حکومت سے متناقض اثر پڑ رہا تھا اس لئے ان کا مدعا تھا کہ طرز حکومت ہی کو بدل دیا جائے عیسائی رعایا نوجوان ترکوں کے دوسرے مقصد سے بالکل متفق تھی۔ لیکن پہلے مقصد میں ان کا ہم خیال ہونا جیسا کہ اوپر بیان

کیا گیا ہے۔ ناممکن ہو چکا تھا + لیکن نوجوان ترک اس اصلیت سے اپنی کم نظری کے باعث ناآشنا تھے + یونان۔ سرویہ۔ بلغاریہ۔ اور رومانیہ میں آزاد قومی عیسائی سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں + اور بقیہ عیسائی بھی ان کے تتبع میں کوشاں تھے + اس "قومیت" کے خیال نے محض عیسائی رعایا پر ہی اثر نہیں کیا تھا۔ بلکہ نوجوان ترک بھی اس سے موثر ہو چکے تھے۔ خصوصاً وہ ترک جو مغربی یورپ میں چند سال مقیم رہ چکے تھے + خود بھی عثمانیہ مملکت میں بغیر بحاظ ملت و مذہب "ترکیت" قائم کرنے کے خواہاں تھے + چنانچہ متضاد خیالات اور مختلف تحریکوں کو ایک رنگ میں پیش کیا جا رہا تھا + جس بات پر یہ دونوں جماعتیں متفق الخیال تھیں وہ عبدالحمید کے استبداد اور اس کے بیجا اقتدار کو توڑنا تھا + اس مدعا میں انہیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی + لیکن جیسے ہی یہ مقصد پورا ہوا + حقیقت کا انکشاف فوراً ہو گیا + اور وہ مختلف اور متضاد تحریکیں اپنے اصلی رنگ میں نظر آنے لگیں۔ بلکہ عیسائی اقوام کو اس سے بہتر کبھی ایسا موقع دستیاب ہی نہیں ہوا تھا + آپس میں تنازع کی وجہ سے حکومت کا

اقتدار اور اس کی قوت بہت کم ہو چکی تھی۔ اور اب عیسائی رعایا
بآسانی حکومت کا مقابلہ کر سکتی تھی + کمیٹی اتحاد و ترقی کا مطمح نظر
"عثمانیت"، قائم کرنا تھا + لیکن عیسائی قوموں نے اس موقع کو غنیمت
جان کر اپنی "قومیت"، کو مستحکم بنانا شروع کر دیا + اسٹریا نے
صوبجات بوسینیا اور ہرزیگونا پر جو ۱۸۷۸ء سے اس کے قبضہ
میں تھے مکمل طور پر تسلط کر لیا + اسٹریا ہی کے ایمائے سے
بلغاریہ نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا + اٹلی نے شمالی
افریقہ میں صوبجات طرابلس۔ بنغازی کو اپنا مقبوضہ بنالیا +
ریاست ہائے بلقان نے متحد ہو کر عثمانیہ صوبجات جو یورپ میں
دریائے میرتسا کے پار واقع تھے۔ فتح کر لئے + چنانچہ ۱۹۱۳ء
میں کمیٹی اتحاد و ترقی کی ناکامی عیاں ہو گئی + نوجوان ترک
کی ناعاقبت اندیشانہ تحریک سے نہ محض مقدونیہ ہی ہاتھ سے
جاتا رہا۔ کہ جس کی خاطر اس نے اپنی تحریک کا آغاز کیا تھا
بلکہ دیگر صوبجات یعنی تھریس۔ البانیہ۔ بوسینیا۔ ہرزیگونا +
طرابلس۔ اور بنغازی بھی سلطنت سے نکل گئے + جنگِ عظیم میں

ترکی کی شرکت کی ذمہ دار بھی "کمیٹی اتحاد و ترقی" تھی اور اس شرکت کے باعث "مریض" ایک دفعہ بالکل لبِ گور تک پہنچ گیا لیکن چرخ نیلوفری نے بیک گردش حالات پھر بدل دیئے اور ترکی کو کشمکش حیات میں پھر ڈال دیا +

باب پانچ

جنگ یورپ کے اختتام پر

جنگ کے اختتام پر ترکی کی حالت بہت ہی نازک تھی اختلال مملکت اور اضمحلال قیادت کی اس سے زیادہ سقیم مثال تاریخ ترکی میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ متواتر دس سال یعنی ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۸ء کی لڑائیوں اور خانہ جنگیوں سے ملک کی حالت بالکل ابتر ہو چکی تھی یونانیوں نے ایسے موقع کو غنیمت جانا۔ اور سمرنا پر مئی ۱۹۱۹ء میں قبضہ کر لیا۔ چونکہ دول متحدہ کی امداد بھی شامل تھی اس لئے یونانی اور بھی دلیر ہو گئے۔ ترکی کے تمام بیرونی مقبوضات اور بیشتر ملکی صوبجات ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ اور ان کے واپس ہونے کی امید موہوم تک نہ تھی۔ اگرچہ دراصل یہ صوبجات ترکی کے لئے گزشتہ زمانے میں وبال دوش ثابت ہو رہے تھے چونکہ ان کو

قبضہ میں رکھنے کے لئے اتنی جانیں تلف ہو رہی تھیں اور اسقدر کثیر خرچ ہو رہا تھا کہ ملک اس کو برداشت کرنے کے قابل نہ تھا کاش! ترکی اِن مقبوضات کے لئے اتنی گراں قربانی کی بھینٹ نہ چڑھاتی۔ لیکن انسانی فطرت کو کون بدل سکتا ہے +

ترکی کے زیر اثر اب نہ عیسائی ملتیں تھیں۔ اور نہ عرب صوبجات + چنانچہ ترکوں میں قومی جوش جو پیشتر چند در چند وجوہ کے باعث دبا ہوا تھا۔ بھڑک اٹھا + گذشتہ دس سال میں ترکوں کا اصل وطن کبھی معرض خطر میں نہ آیا تھا + لیکن جب یونانیوں نے سمرنا پر قبضہ کر لیا۔ تو حالت دگرگوں ہوگئی + اور ترکوں کو اپنی ہستی قائم رکھنا بھی دشوار معلوم ہونے لگا۔ اس لئے سب طرف سے منہ پھیر کر ترک اپنی ہستی اور اپنی آزادی قائم رکھنے کے لئے کوشاں ہوگئے + اور اتحاد اسلامی Pan-Islamism و اتحاد تورانی Pan-Turanism کی تحریکوں کو خیرباد کہکر خود اپنے قدموں پر کھڑے ہوگئے + یونانیوں کو اپنے ملک سے نکال کر دول متحدہ سے مکمل آزادی حاصل

کرنے کے علاوہ ترک اپنے آپ کو فی الحقیقت خود مختار بنانا چاہتے تھے۔ وہ یہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ اگر اقتصادی حالت کو درست نہ کریں گے، تو محض جنگ کی کامیابی اقتدار قائم رکھنے کے لئے کافی نہ ہو گی۔

اس کے ساتھ ہی معاشرتی انقلاب بھی وقوع میں آرہا تھا جس سے خاص طور پر طبقہ نسواں کی حالت میں حیرت انگیز تغیرات رونما ہو چکے تھے۔ گزشتہ جنگ کے باعث تمام شریک جنگ ممالک کی حالت ابتر ہو چکی تھی اور جو ملک جتنا ترقی یافتہ تھا۔ اس نے اسی قدر شدت سے جنگ میں حصہ لیا تھا اس لئے اب وہ اسی قدر خستہ حال ہو چکا تھا۔ اور اس کے ذرائع جنگ میں بھی باندازہ حیثیت کمی آچکی تھی۔ برطانیہ فرانس اور جرمنی جو اپنا بہترین سرمایہ جنگ کے نذر کر چکے تھے۔ اب مقابلتاً بہت کمزور ہو گئے تھے۔ لیکن روس اور ترکی کی حالت اتنی خراب نہ تھی۔ چنانچہ اوّل الذکر ممالک میں رائے عامّہ مزید جنگجوئی کے بالکل مخالف تھی۔ اور چونکہ مشرق قریب اور مشرقِ وسطیٰ میں

برطانیہ یا فرانس کے حقوق کا کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا۔ اس لیے ان مقاموں پر تمام فوجی اخراجات بند کر دینے کے لیے عوام زور دے رہے تھے۔ زیادہ تر یہی وجہ تھی کہ برطانیہ اور فرانس ہر چند کہ انکی ہمدردی یونانیوں سے وابستہ تھی۔ علانیہ طور پر یونانیوں کی جانب سے ترکی پر فوج کشی نہ کر سکے۔ اور اسی لئے جنگ یونان و ترکی سنہ ۱۹۱۹ء سنہ ۱۹۲۲ء میں ترکی کو فتح ہوئی

ایک اور واقعہ جس سے ترکی کو تقویت حاصل ہوئی وہ سنہ ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب تھا۔ بالشویکوں نے جو برسر اقتدار تھے روس کے گذشتہ طرز عمل کو بالکل بدل دیا تھا۔ اس سے قبل روس اسلام کا قدیمی دشمن تصور کیا جاتا تھا۔ اور اس عداوت کا اظہار اس قدر شدت سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ جیسا کہ گذشتہ دس سال میں یعنی سنہ ۱۹۰۷ء سے سنہ ۱۹۱۷ء تک۔ کہ جس زمانہ میں برطانیہ نے بھی روس کو چیرہ دستی سے باز رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی سنہ ۱۹۱۷ء میں زاریت کا خاتمہ ہوا۔ اور سوئیٹ جمہوریت ظہور میں آئی۔ سوئیٹ کو شروع ہی سے برطانیہ و فرانس کی مخالفت

کرنی پڑی + گذشتہ دس سال سے برطانیہ - روس کی طرف
تھی - اور اس کے باعث اسلامی دنیا نے بھی اس کی جانب
سرد مہری اختیار کر لی تھی + اس واقعہ سے بالشویک نے جو دوا
متحدہ سے متنفر ہو گئے تھے پورا فائدہ اٹھایا + وہ اب ترکی کے
بہی خواہ بن گئے اور اس طرح سے اسلامی دنیا کی ہمدردی
اپنی طرف رجوع کر لی چنانچہ اب برطانیہ کی جگہ سویٹ اپنے آپ
کو مسلمانوں کا مددگار جتانے لگے + اور روس کے بجائے برطانیہ
مسلمانوں کا عدو تصور کیا جانے لگا - یعنی سابق حالت بالکل عکس
ہو گئی + سویٹ نے اپنی ہمدردی کا عملی ثبوت یونانی حملہ کی مخالفت
میں دیا - اور ۱۹۱۹ء میں دول متحدہ کے خلاف ترکی کی کمک کے
لئے فوجی تیاریاں شروع کر دیں + مصطفیٰ کمال نے بھی تحریکات "اتحاد
اسلامی" اور "اتحاد تورانی" کو کہ جن پر گذشتہ زمانے میں بہت
اعتماد کیا جاتا تھا خیر باد کہہ دیا اور اس وجہ سے اتحاد روس و ترکی
میں اور بھی آسانی پیدا ہوئی - اس اتحاد سے سویٹ کا اولین
مقصد یہ تھا کہ بحیرہ اسود کے قرب و جوار سے دول متحدہ کے اثر کو

زائل کر دے۔ کیونکہ اس اثر کے باعث جمہوریہ سوئٹ کے اندرونی تفرقہ میں اور زیادتی ہو رہی تھی + علاوہ اس کے حکومت سوئٹ کو ایک مناسب موقعہ دستیاب ہو رہا تھا کہ وہ اپنے قول کا عملی ثبوت دیکر اسلامی دنیا کو یقین دلائے۔ کہ وہ مسلمانوں کے طرفدار ہے۔ ہرچند ابھی تک وثوق کے ساتھ یہ پیشین گوئی نہیں کیجا سکتی کہ روس اپنے وعدے پر مستقل مزاجی سے جما رہیگا یا نہیں لیکن اس موقعہ پر روس کی مدد نہایت ہی قابل قدر اور کار آمد ثابت ہوئی + علاوہ فوجی کمک کے روس کی مدد ترکی کے لئے نہایت حوصلہ افزا تھی۔ ترکی یہ محسوس کرنے لگی کہ اس کی سیاہ بختی کے زمانہ میں بھی کم از کم ایک قوت اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ اور وہ دُوَلِ متحدہ کے مقابلہ میں بالکل تنہا نہیں +

چنانچہ ترکی کی وہ نئی تحریک جس کا آغاز ۱۹۱۹ء میں ہوا + گذشتہ تحریکات سے بہت مختلف ماحول میں شروع ہوئی + وہ حالات جو اس موقعہ پر رونما ہو رہے تھے یقیناً ترکی کے حق میں فائدہ مند تھے + اس قسم کے مواقع کبھی پہلے دستیاب ہوئے

تھے۔ اگر انور اور طلعت اور جاوید کو یا مدحت پاشا کو بھی ایسے حالات کے تحت میں اپنی تحریکات پھیلانے کا موقعہ ملتا تو شاید وہ بھی اسی قدر کامیاب ہوتے جیسا کہ مصطفیٰ کمال + بہر حال مصطفیٰ کمال نے جس بہادری اور مستقل مزاجی سے فاتح دول متحدہ کا مقابلہ کیا وہ قابل ستائش ہے۔ کیونکہ ہر چند کچھ ایسے اندرونی واقعات رونما ہو رہے تھے کہ جن سے ترکی کو مدد ملی اور جو مصطفیٰ کمال کی دوربین آنکھوں سے پوشیدہ نہ تھے۔ اور پھر وہ توقعات کے مطابق وقوع میں بھی آئے تاہم ظاہرہ حالات سے ترک غالباً کبھی اس سے قبل اس قدر عاجز اور بیکس نہ ہوئے تھے درحقیقت "ترکی تمام شد"، کا مرقع دنیا کے پیش نظر تھا + سلطنت عثمانیہ کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ اور اس کے صوبجات غیر مرکزی حالت میں مطلق العنانی کا دعویٰ کر رہے تھے + تمام عرب آزادی کے فریب پر مفتوں ہو کر دوسروں کے کہنے پر چل رہا تھا چنانچہ عرب میں ہر جگہ نئی نئی برائے نام آزاد سلطنتیں قائم ہو رہی تھیں جو دراصل بیرونی طاقتوں کے زیر اثر تھیں + عراق کی علیحدہ مملکت قائم ہو چکی تھی جو برطانیہ

سے زیر اثر تھی +

شاہ حسین نے جو عراق کے حکمراں امیر فیصل کا باپ تھا۔ تخت حجاز پر متمکن ہو کر خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا + فلسطین برطانیہ کے زیر اقتدار یہودیوں کا آزاد وطن قرار دیا گیا تھا۔ اور شام پر فرانس کا تسلط ہو گیا تھا + مصر کو بھی "عثمانیہ اثر" سے آزاد کرا دیا تھا۔ اور برطانیہ نے شاہ فواد کو خود مختار تسلیم کر لیا تھا۔ آرمینیہ اور کردستان کی آزادی کے لیے بھی کوشش ہو رہی تھی۔ سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ کم و بیش ہو ہی چکا تھا + وہ عظیم الشان سلطنت جس کی تعمیر شاہ سلیمان نے کی تھی۔ اور جس کے مقابلہ میں فارس اور روم کی قدیم سلطنتیں بھی ماند تھیں منہدم ہو چکی تھی + اس پر شکوہ اور وسیع مملکت میں سے ایشیائے کوچک کا ذرا سا اندرونی حصہ حریص نگاہوں کی چیرہ دستی سے بچ رہا تھا + اس جگہ کے باشندے ہم قوم اور ہم مذہب ہیں اور یہیں سے جدید ترکی کا آغاز ہوا + اناطولیہ کا یہ حصہ اور آبنائے باسفورس کا باقی ماندہ یورپین ساحل۔ افلاس اور اخلاقی پستی میں ڈوبا ہوا تھا + شکست کی وجہ سے اس کی حالت اور بھی زار

ہوگئی تھی۔ بارہ سال کی متواتر جنگ کے باعث ملک میں انحطاط اور زوال کے اثرات ہر جگہ رونما ہو چکے تھے۔ آبادی بہت کم ہوگئی تھی۔ اقتصادی ابتری کی وجہ سے ملک کی اندرونی فلاح و بہبودی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ ترکی کے سب مقبوضات چھن چکے تھے۔ مددگار سلطنتیں شکست پا کر خاموش ہوگئی تھیں اور دنیائے اسلام میں بھی سوائے مسلمانان ہند کے بقیہ اسکی طرف سے منہ موڑ چکے تھے۔

قسطنطنیہ جو پانچ سو سال سے باعث اقتدار اور فخر سلطنت تھا۔ اب فاتحین کے قدموں پر سرنگوں پڑا تھا۔ ترکی کو ہر چہار طرف سے اعدا گھیرے ہوئے تھے۔ اور ان کی حریص نگاہیں منتظر تھیں کہ پہلے ہی موقعہ پر صد نونکی تمنا کو پورا کریں۔ چنانچہ ملک گیری کے خواہاں اپنے قدیم ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیئے ہر لمحہ تیار تھے۔ غرضیکہ ترکی کی حالت نہایت قابل رحم تھی اور جانکنی کے تمام علامات رونما ہو رہی تھیں کہ صلحنامہ مدرسن ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو وقوع میں آیا۔ اس موقع پر جو شرائط بھی ترکی پر عائد کی جائیں

اسکو وہ سب منظور ہوئیں۔ جنگ کا اختتام ہوا۔ اور ترک ایک دلِ آزار
تنکیب کے ساتھ دولِ متحدہ کے جملہ احکامات ماننے کیلئے تیار ہو گئے۔
آبنائے باسفورس پر دولِ متحدہ نے قبضہ کر لیا + اور اس طرح ترکی کو
اپنے گھر میں عاجز و مجبور بنا دیا + دو سال تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا +
اور ترکی بیقراری کی حالت میں منتظر رہی + دولِ متحدہ پہلے یورپ کی طرف
متوجہ ہوئے۔ اور وہاں کے متعلق فیصلہ میں مشغول رہے۔ ترکی کو
وہ لاچار و بیکس کر چکے تھے + اس لئے کوئی فوری خدشہ نہ تھا + آخر کار
سان ریموں کانفرنس اپریل ۱۹۲۰ء میں منعقد ہوئی۔ اور ترکی کے مسئلہ
پر غور کیا گیا + لیکن اس دو سال کی قلیل مدت میں صورت حالات بہت
کچھ بدل چکی تھی +

اس دوران میں کہ جب بیکس ترکی پر متواتر دو سال تک اضطرابی
کیفیت طاری تھی دولِ متحدہ آپس میں مخفی طور پر اقرار نامہ اور معاہدے
کر رہے تھے + مہذب اقوام کی یہ شرمناک حرکات خواہ کتنی ہی زبوں کیوں
نہ ہوں۔ لیکن انسانی فطرت کے مطابق ضرور تھیں + دولِ یورپ دیکھ
رہے تھے کہ ترکی لاچار ہو چکی ہے۔ وہ اس موقع کو غنیمت جان کر

ترکی کو صفحہ ہستی سے بالکل نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے + اس تقسیم کیلئے دوران جنگ میں کم از کم چار ایسے معاہدے ہوئے کہ جن کی شرائط کا انکشاف ضروری اور مناسب ہے۔ اور جن سے جنگ میں شرکت کرنیوالوں کی ذہنیت کا بھی پتہ چلتا ہے + انہیں معاہدوں کی بنا پر دولِ متحدہ کی آپسمیں گفت وشنید ہو رہی تھی + اور اسی کے باعث حالات میں اور پیچیدگی بڑھ رہی تھی + ان معاہدوں میں سے اولیں ۱۹۱۵ء کو مابین برطانیہ۔ فرانس اور روس طے ہوا۔ اور "اقرار نامہ قسطنطنیہ" کے نام سے موسوم کیا گیا + اس اقرار نامہ میں روس کو اجازت دیگئی تھی کہ وہ قسطنطنیہ۔ آبنائے فاسفورس۔ ہر دو ساحل بحیرہ مارمورا۔ دورہّ دانیال کو فتح کرلے بشرطیکہ قسطنطنیہ میں دولِ متحدہ کی تجارتی جہازوں کی آمد و رفت کے لئے کوئی روک ٹوک نہ ہو۔ یہ بھی طے ہوا تھا کہ مقدس مقامات کو ترکی کے قبضہ سے نکال کر ایک آزاد مسلم حکمران کے ماتحت کر دیا جائے لیکن اٹلی نے بھی جنگ میں شرکت کی اور اسلیئے ۲۶ اپریل ۱۹۱۵ء کو ایک جدید "معاہدہ لندن" پر دستخط کیے گئے + اس معاہدے میں اُن شرائط کی کہ جنپر اٹلی نے شرکتِ جنگ کی تھی صراحت کی گئی اور ترکی کی تقسیم کے

متعلق کہ جسکی توقع اختتام جنگ پر وثوق کے ساتھ کی جا رہی تھی فیصلہ کیا گیا + بعدازاں ۱۶ مئی ۱۹۱۶ء کو ایک اور اقرار نامہ مابین برطانیہ عظمیٰ فرانس اور روس طے پایا + کہ جسمیں عرب صوبجات کو آزاد کرنے کے متعلق فیصلہ کیا گیا تھا اور ان کو برطانیہ اور فرانس کے زیراثر رکھنے کی تجویز کی گئی تھی + اور چونکہ اٹلی بھی دول متحدہ کی شریک ہو گئی تھی اسلئے اس کے حقوق کا بھی خیال رکھنا لازمی تھا + اور اس مقصد کے لئے ۱۷ اپریل ۱۹۱۷ء کو ایک اور معاہدہ مابین برطانیہ اور اٹلی طے ہوا۔ اس معاہدے کی بنیاد گذشتہ اقرار نامہ پر تھی + مندرجہ بالا معاہدات کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اختتام جنگ سے قبل ترکی کی تقسیم کے لئے دولِ متحدہ کس قدر کوشاں تھے اور ہر ایک حکومت اس تقسیم سے متمتع ہونے کی کسقدر خواہاں تھی + صلحنامہ سیورے ۔ انہیں خفیہ معاہدوں کا نتیجہ تھا کہ جن سے ترکی آخری وقت تک بے خبر تھی۔ مگر دولِ متحدہ کی انفرادی خودغرضی سے صورت حالات پیچیدہ تر ہو گئی ۔ اطالی "معاہدۂ لندن" کی رو سے سمرنا پر قبضہ کرنا چاہتے تھے +

اور اس مقصد کے لیئے انہوں نے اپریل ۱۹۱۹ء میں پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ لیکن دول متحدہ کو اور خاص کر یونان کو اس طرز عمل سے بہت خدشہ پیدا ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دول متحدہ نے یونان کو سمرنا پر قبضہ کرنے کی اجازت دیدی + اگرچہ بظاہر اس کی وجہ ترکی فوج کی زیادتی قرار دی گئی تھی لیکن اس غلط بیانی کی تردید خود دول متحدہ کی مقرر کردہ تحقیقاتی انجمن نے ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۹ء کی تحریر میں کی + ہرچند اس غلطی کو تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن پھر بھی سمرنا پر یونانی قبضہ کو جائز قرار دیا گیا۔ اس وقت یونانی خواہشات ملک گیری کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ اپنی گذشتہ قدیم سلطنت کی تجدید کے خواب دیکھ رہے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ از سر نو عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ شروع ہو جائے گا۔ برطانیہ۔ فرانس اور امریکہ کے جنگی جہازوں کی محافظت میں یونانی فوج نے سمرنا پر ۱۵ر مئی ۱۹۱۹ء کو قبضہ کر لیا۔ اور اس کے ساتھ ہی جو سفاکانہ اور ظالمانہ حرکات یونانی فوج سے دانستہ سرزد ہوئیں۔ انکی زمانہ حال میں مثال مشکل سے

مل سکتی ہے۔ قتل و غارت کا بازار گرم تھا ہر جگہ لوٹ مار جاری تھی۔ یہاں تک کہ تاتاری وحشیانہ حملوں کی یاد از سر نو تازہ ہو گئی + ایک ظاہرہ مہذب قوم کے اس وحشیانہ طرز عمل سے تمام دنیا حیرت زدہ رہ گئی + یہ آفت جس قدر تقظلم ریز تھی اس سے زیادہ اشتعال خیز ثابت ہوئی اور اسی صدمہ کے باعث اناطولیہ کی پژمردہ قوم کے احساس ایسے موجزن ہوئے کہ ان کا مقابلہ تمام یورپ کے لیئے ناممکن ہو گیا + اس قومی تحریک کی رہنمائی کا سہرا مصطفیٰ کمال کے سر ضرور رہی لیکن جذبات کا برانگیختہ ہونا یونانی سفاکی ہی کا کرشمہ تھا + چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین سال کی مزید خونریز جنگ کے بعد یونانیوں کو سخت شکست کیساتھ پسپا ہونا پڑا +

اسی دوران میں کہ جب یونانی سمرنا پر قبضہ بیجا کے لیئے کوشاں تھے اور جبکہ ترک اناطولیہ کے اندرونی حصہ میں اپنی فوج کو خاموشی کے ساتھ ترتیب دے رہے تھے۔ دول متحدہ تمام خفیہ معاہدوں کی شرائط یکجا کرنے میں مشغول تھیں + مختلف معاہدوں کی شرائط کو ترتیب دیکر ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو ایک مسودہ ترکی نمایندوں

کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور ان کے اعتراضات کو سرسری طور پر خارج کر دیا گیا۔ اس مسودہ کی بنا پر صلحنامہ سیورے تیار ہوا کہ جس پر سلطان کے فرستادہ نمایندگان باب عالی نے بغیر چون و چرا دستخط کر دیئے۔ اور وہی سلطان ترکی کو بھی مجبوراً تسلیم کرنا پڑا۔ لیکن صلحنامہ سیورے درحقیقت مہذب اقوام کے منور چہرے کا بدترین داغ ہے۔ اور مغرب کی ہوس ملک گیری اور دراز دستی کا بہترین نمونہ ہے۔ وہ اقوام کہ جنہوں نے جنگ میں شرکت بظاہر اس مدعا سے کی ہو کہ کمزور اور چھوٹی سلطنتوں کے حقوق کو پامال ہونے سے بچائیں اور ایک ایسی صلح کے بعد کہ جس میں اعلیٰ ترین اخلاقی معیار پیش نظر رکھے گئے ہوں اور جس میں چھوٹی سلطنتوں کا آزادانہ قیام فرض منصبی سمجھا گیا ہو اور جس میں دنیا کے قابل ترین مدبران شامل ہوں۔ اگر ایک ایسا معاہدہ تیار کریں کہ جیسا صلحنامہ سیورے تھا تو بجز اس کے کہ اس معاہدہ کو غداری اور کذب کا بدترین مرقع سمجھا جاوے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ مغرب کی صدیوں کی تمنائیں "مریض ترکی" کے ہلاکت کے ساتھ وابستہ تھیں اور اسوقت

اسی مریض کی زندگی یورپ کے ہاتھ میں تھی۔ یہ موقع تھا کہ اہل
یورپ ہمیشہ کے لیے تاریخ میں نیک نام بنتے اور اپنی نیک نیتی
کا ثبوت دیدیتے۔ لیکن افسوس کہ انسانی فطرت باوجود ان کی
اس قدر تہذیب اور اخلاقی ترقی کے ان پر غالب آئی اور وہ
"مریض ترکی" کی ہلاکت کے لیے کوشاں ہو گئے۔ جن فیاضانہ جذبات
کا اظہار بلجیم۔ یونان۔ اور سروبیا کے متعلق ہو رہا تھا کیا وہ ترکی کے
لیے ناموزوں تھے؟ لیکن ملک گیری کی خواہش نے اس قدر
حریص کر دیا تھا کہ اہل یورپ ترکی کو سوائے اس نقطہ نظر سے اور
کسی طرح دیکھ ہی نہ سکتے تھے۔ صلحنامہ سیورے کا مدعا یہ تھا۔ کہ
نصف سے زیادہ اور وہ بھی ملک کا بہترین حصہ ترکی سے غصب
کرکے دول متحدہ میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور عرب صوبجات کو
برائے نام آزادی دیکر مغربی اقوام کے زیر اقتدار کر لیا جائے۔
اہل یورپ منتظر تھے کہ اس صلحنامہ سے امن و امان قائم ہو جائیگا
لیکن بجائے امن کے جنگ کی آگ دوبارہ بھڑک اوٹھی۔ صلحنامہ
سیورے کی تاریخ کو قومی دن قرار دیکر تمام ترکی میں غم کا اعلان

کر دیا گیا + قسطنطنیہ کے تمام اخبارات کو سیاہ حاشیہ کا ماتمی لباس پہنایا گیا۔ استنبول کی تفریح گاہوں کو بند کر دیا گیا۔ اور تمام دن ملک کی نجات کے لیئے دعائیں مانگی گئیں + یہ اظہار غم محض ارتخلافہ ہی میں محدود نہ تھا۔ بلکہ ملک کے اندرونی حصوں سے بھی صدائے رنج ومحن برابر اٹھ رہی تھی +

اناطولیہ کی انقلاب پسند جماعت پر یہ صدمہ حد درجہ شاق گذرا اور اس جماعت نے فوراً ہی صلحنامہ کو ناجائز قرار دیکر اس کی شرائط ماننے سے انکار کر دیا + اس جماعت کے نزدیک حکومت قسطنطنیہ کا طرزِ عمل غدارانہ تھا۔ کیونکہ وہ دول متحدہ کے اشاروں پر عمل پیرا ہو رہی تھی۔ اس لیئے اس حکومت کو قوم کی جانب سے نمایندگی کا کوئی استحقاق باقی نہ رہا تھا + مصطفیٰ کمال کی نگرانی میں "قومی تنظیم" نے ایک نئے جوش کے ساتھ کام شروع کر دیا + اس کا مدعا تھا کہ صلحنامہ سیورے کو منسوخ کیا جائے اور کم از کم اپنے وطن اناطولیہ کو دول متحدہ کے ظالمانہ چنگل سے بچایا جائے + حبّ وطنی کا جذبہ ہر شخص کے دل میں موجزن تھا۔ اور

اس لئے قومی تنظیم کو متفقہ مدد ملی۔ بعد ازاں حکومت قسطنطنیہ کا خاتمہ ہوا اور اس کے بجائے انگورا میں ایک نئی حکومت قائم ہوگئی کہ جس نے صلحنامہ سیورے کو تسلیم کرنے سے بالکل انکار کر دیا اس طرح سے دول متحدہ کی ترکی کو ہلاک کرنے کی کوششیں آخر ناکامیاب ثابت ہوئیں۔

باب چہم

انقلاب کے اولین آثار

صلحنامہ مدوس ۱۹۱۸ء کے بعد تمام ترکی پر مایوسی چھا رہی تھی سلطنت عثمانیہ کی حالت اس سے قبل اس قدر نازک شاید ہی کبھی ہوئی ہوگی۔ "مریض ترکی" آخری سانس لے رہی تھی اور سوائے اناطولیہ کے جہاں ابھی کسی قدر حرارت عمل محسوس ہوتی تھی۔ باقی تمام حصوں پر مردنی غالب آچکی تھی۔ گذشتہ اقتدار و منزلت کے آخری آثار رفتہ رفتہ زائل ہو رہے تھے۔ کہ دفعتاً قسمت نے پلٹا کھایا۔ اور "دست از غیب برون آید وکارے بکند" کے مصداق ایک ترکی سپاہی مصطفےٰ کمال کی شکل مایوسی کی دھندلی شفق پر نمودار ہو کر افق عروج پر رفتہ رفتہ منور ہونا شروع ہوئی۔ مصطفےٰ کمال کے ورود نے واقعات کی رو کو پلٹ دیا۔ اور ایک ڈوبتی ہوئی قوم کو جور و تظلم کے بحر سے ساحل امن پر اٹھا لیا۔ ترکی کی آیندہ تاریخ

اس نامور سپاہی کے کارناموں سے رنگی ہوئی ہے۔ اور اس لئے یہ مناسب ہے کہ اس جید شخصیت کے حالات کا ذکر ذرا وضاحت سے بیان کیا جائے۔ مصطفیٰ کمال بمقام سالونیکا ۱۸۸۱ء میں تولد ہوا ایام طفولیت ہی سے اپنے شہر کے فوجی افسروں کو سجیلی وردیوں میں ملبوس دیکھ کر اس کے دل میں فوجی زندگی کی اُمنگ پیدا ہوتی تھی اور اس نے اوائل عمر سے ہی فوجی زندگی اختیار کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ بائیس سال کی عمر میں فوجی درسگاہ سے تکمیل تربیت کی۔ اور دمشق کے ایک فوجی رسالہ میں بحیثیت افسر مقرر ہو گیا۔ مصطفےٰ کمال ابتدا ہی سے اپنے ملک کی آزادی کا خواہاں تھا۔ وہ ایک بہادر سپاہی تھا۔ اور خود سر اتفاقاً وہ شروع کے زمانہ ہی میں اس تحریک سے متاثر ہو چکا تھا۔ جو سلطان عبدالحمید کی حکومت کے خلاف تھی۔ صوبہ بلقان اور خصوصاً سالونیکا میں اس تحریک کا زور زیادہ تھا مصطفےٰ کمال "نوجوان ترکوں" کے زمرہ میں شامل ہو کر اس تحریک کا ایک جوشیلا داعی بن گیا۔ انقلاب ۱۹۰۸ء تک مصطفیٰ کمال کو اس کی بدولت

کئی سیاسی مراحل طے کرنے پڑے + کہیں جلا وطن ہوا۔ اور کہیں
جیل خانہ میں پڑا رہا + جب سوئم لشکر نے قسطنطنیہ پر۔ سلطان عبدالحمید
کو بہ جبر سیاسی مراعات عطا کرنے کیلئے چڑھائی کی۔ اس وقت
مصطفیٰ کمال محمود شوکت پاشا۔ قائد لشکر کا ناظم سپاہ تھا + اس کے
بعد مصطفیٰ کمال نے مختلف محاذ پر رہ کر جنگ بلقان و جنگ یورپ
میں حصہ لیا + وہ ہر تجربہ سے فائدہ اٹھاتا رہا اور اپنی شخصیت و قابلیت کی بنا
پر سپاہیوں اور افسروں سے خراج تحسین وصول کرتا رہا۔ ورہ دانیال
پر برطانیہ فوج کا پسپا کرنا اسی کا کرشمہ تھا + مصطفیٰ کمال کی مقبولیت
اور شہرت اب عام ہو چکی تھی۔ اس کے سوانح زندگی کرامویل سے
جو انگلستان میں ۱۶۵۳ء سے ۱۶۵۸ء تک حکمران رہا۔ بہت ملتے
جلتے ہیں + دونوں میں ایک بیّن مناسبت ہے۔ اگرچہ مذہب کے
متعلق اصولی اختلاف بھی عیاں ہے۔ لیکن کرامویل کی طرح مصطفیٰ نے
بھی فوج کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور انتہائی سیاسی تدبر کے ساتھ
فوج کے ذریعہ ایک جابرانہ شاہی حکومت کے ٹکڑے اڑا دیئے
انگورا میں ایک قومی مجلس کی بنیاد ڈالی کہ جس نے اس کو نہ صرف

سپہ سالار ہی قرار دیا بلکہ صدر جمہوریت بھی منتخب کیا + غرضیکہ ایک مہربان حکمران کے مانند اپنی مردہ قوم کو شفقت سے دوبارہ جلا دیا + مصطفیٰ کمال نے منتخب شدہ قومی مجلس کے ذریعہ انقلاب کو تکمیل تک پہنچایا + اتنی قلیل مدت میں اس قدر کر دکھانا زمان حال کا ایک معجزہ ہے +

صلحنامہ مدرس ۳۰ر اکتوبر ۱۹۱۸ء کے بعد قسطنطنیہ میں ایک عجیب ہل چل مچ گئی تھی + آئینی مجلس کا خاتمہ کر دیا گیا تھا اور ہر طرف سے مایوسی کے آثار نظر آ رہے تھے + مصطفیٰ کمال اس وقت فلسطین میں فوج کا افسر اعلیٰ تھا۔ اپنے ملک کو بیرونی تصرفات سے آزاد رکھنے اور اندرونی حالات کو درست کرنے کی غرض سے وہ فوراً دارالسلطنت کو واپس آیا + قسطنطنیہ میں چونکہ دول متحدہ کا قبضہ تھا۔ اس لئے اس کے ایما سے مصطفےٰ کمال کو شرقی صوبجات کی فوج کا انسپکٹر جنرل مقرر کر کے ایشیائے کوچک کو روانہ کر دیا گیا + تھوڑے عرصہ بعد مصطفےٰ کمال سے ہجولی رؤف بے کو بھی جو ایک مشہور بحری افسر تھا۔ اور جس نے صلحنامہ مدرس پر دستخط کئے تھے۔ استنبول سے

روانہ کر دیا گیا۔ اناطولیہ میں پہنچکر مصطفیٰ کمال کا مدعا تھا کہ مقامی تحفظی تنظیم کو قومی مجلس کی شکل میں لے آئے۔ اور فوج کا اعتماد حاصل کرکے اس کی مدد سے حکومت قسطنطنیہ پر اثر ڈالے تاکہ دول متحدہ کے ساتھ گفت و شنید میں ملک کی بہبودی کا خیال مقدم رکھا جائے۔ رؤف بے سمرنا روانہ کر دیا گیا کہ وہاں پر قومی جماعت کی تنظیم کرے۔ اور مصطفیٰ کمال خود سمسون اسی غرض کے لئے چلا گیا۔ دونوں جگہ کامیابی ہوئی اور قومی جماعتیں قائم ہو گئیں۔ اور ایک مختصر سی فوج بھی مرتب ہو گئی۔ اسی دوران میں کہ جب یہ قومی جماعت رفتہ رفتہ اپنی فوج کو مرتب کر رہی تھی۔ ملک میں اہم سیاسی تحریکیں رونما ہو رہی تھیں۔ سمرنا اور سمسون کی اولین کامیابی کے بعد مصطفیٰ کمال نے قومی جماعت کا پہلا اجتماع ارض روم میں ۲۳ر جولائی ۱۹۱۹ء کو کیا۔ اس وسیع اجلاس میں آیندہ کے طرز عمل کے متعلق فیصلہ کیا گیا۔ اور اگرچہ جملہ کارروائی خفیہ رکھی گئی تھی۔ لیکن ایک سرکاری اطلاع دول متحدہ کے ہائی کمشنر متعینہ قسطنطنیہ کو روانہ کر دی گئی۔ اس جلسہ کی ایک اہم کارروائی "مجلس برائے تحفظ حقوق قومی" کا قائم ہونا تھا۔ جس کا نام

بعد میں بدل کر "قومی تنظیم" کر دیا گیا + آیندہ طرز عمل سے متعلق اصولی
مباحثہ ہوئے اور کئی قرارداد منظور کئے گئے + دو ماہ بعد ۴ ستمبر ۱۹۱۹ء
کو دوسرا جلسہ سیواس میں منعقد ہوا تاکہ وہ مقامی جماعتیں جو اپنے
نمایندے جلسہ میں نہ بھیج سکی تھیں اب اپنی رضامندی کا اظہار
کر سکیں +

اس جلسہ کے منظور شدہ قرارداد مشتہر کر دی گئی۔ اور
ایک انتظامیہ جماعت مصطفے کمال کی زیر صدارت مجلس کیجانب
سے قائم کی گئی + اس انتظامیہ جماعت کے دیگر افراد میں سے
قابل ذکر رؤف بے و بکر سامی بے و احمد رستم بے ہیں + رؤف بے
مصطفی کمال کا عزیز دوست تھا اور گذشتہ حکومت میں وزیر بحری
کے عہدہ پر ممتاز رہ چکا تھا + جنگ بلقان کے دوران میں جنگی
جہاز حمیدیہ کے افسر اعلیٰ کی حیثیت میں یونانی ساحلی حدود پر
متعدد حملے کر چکا تھا صلحنامہ مدرس کے دستخط کرنے والوں میں یہ
بھی شامل تھا۔ اور قومی تحریک میں اپنے ہمراہ کئی بحری افسر اور
جہاز راں ساتھ لایا تھا + بکر سامی بے اناطولیہ کا سابق گورنر جنرل

تھا اور احمد رستم بے واشنگٹن میں ترکی سفیر سلطنت رہ چکا تھا + انتظامیہ
جماعت نے انگورہ کو اپنا صدر مقام قرار دیا چونکہ قسطنطنیہ اور
اس کے درمیان تار برقی کا سلسلہ قائم تھا اور وہاں ریل کا اسٹیشن
بھی تھا +

مقامی امدادی فوجوں کو تنظیم دیکر قومی عسکر میں شامل
کرلیا گیا۔ ترکی کے دو بہترین جنرل اس کے نگران رکھے گئے + کاظم
پاشا اور علی فواد پاشا شرقی و غربی اناطولیہ کے قائد مقرر کئے گئے +
جلسہ سیواس کے بعد تین سال تک قومی مجلس کو بیشتر جنگ میں مشغول
رہنا پڑا لیکن سیاسی امور کے لئے انگورہ میں جلسے منعقد ہوتے رہے
اور اس پریشانی کے زمانہ بھی حکومت کا کام جاری رہا + انگورہ
کا انتخاب بحیثیت مرکز۔ دو وجوہات سے کیا گیا تھا + مصطفی کمال
کی جماعت کو انقلاب پسند باغی سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ سلطان کی
حکومت قسطنطنیہ میں ابھی تک قائم تھی اس لئے قومی مجلس کی جملہ
کارروائی خفیہ طور پر دشوار گذار مقاموں مثلاً ارض روم سیواس اور انگورہ
میں کی جاتی تھی خصوصاً انگورہ میں کہ جو قسطنطنیہ کے قریب ہونے

کے باوجود ایک کوہستانی سلسلہ کے باعث بیرونی حملہ کی صورت
میں نہایت ہی محفوظ مقام ہے اور ریل کی وجہ سے ملک کے
دور دراز حصوں سے آمد و رفت میں بھی دشواری نہیں ہوتی +
انگورہ کے تارگھر کے ذریعہ قسطنطنیہ اور سمرنا سے پیغام بھی بآسانی
آجا سکتے تھے۔ لیکن ریل اور تاروں کا سلسلہ حسب خواہش منقطع
کیا جا سکتا تھا + چنانچہ ان وجوہات کی بنا پر انگورہ قومی مجلس کا
صدر مقام بن گیا۔ اور بعد ازاں اناطولیہ کا دارالسلطنت قرار پایا +
محفوظ مقام ہونے کے علاوہ اس میں کوئی اور خصوصیت نہ تھی۔ بیشتر
مکانات خراب او خستہ حالت میں تھے۔ سڑکیں اور بھی گئی گذری
تھیں۔ اور حفظان صحت کی تو پروا تک بھی نہ تھی + قسطنطنیہ میں
۵ راکتوبر ۱۹۱۹ء کو داماد فرید کی وزارت کو شکست ہوئی اس کی
جگہ علی رضا بے نے ایک نئی وزارت کو ترتیب دی۔ اور سلطان
کے فرمان کے مطابق عام انتخاب عمل میں آیا + لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ منتخب شدگان میں سے بیشتر قومی مجلس کے ہی خواہ نکلے حتیٰ کہ وزیر اعظم
بذات خود مصطفےٰ کمال کی تحریک سے ہمدردی رکھتا تھا + انگورہ میں

قومی مجلس کا ایک اور جلسہ منعقد ہوا۔ اس موقع پر مصطفےٰ کمال نے ایک نہایت اہم تحریر مجلس کے سامنے پیش کی جو بعد میں "قومی معاہدہ" کے نام مشہور ہوئی + اس تحریر کی تمامتر بنیاد ارض روم کی تجاویز پر مبنی تھی دراصل اس تحریر کا مدعا ترکی قوم کی آزادی کا اعلان تھا۔ اس مختصر تحریر میں آزادی کا پرجوش اعلان کیا گیا۔ اور اسی کے اصول لوزان کانفرنس کے وقت پیش نظر رکھے گئے +

دول متحدہ کیجانب سے یہ اظہار کیا گیا کہ اگر اس قومی مجلس کا انعقاد دارالخلافت قسطنطنیہ میں اور سلطان کی صدارت میں ہو۔ تو وہ اس کی کارروائی کو جائز تسلیم کر لیں گے + چنانچہ ۱۱ رجنوری ۱۹۲۰ء کو یہ "قومی معاہدہ" جائز اور تسلیم شدہ مجلس میں پیش کیا گیا۔ اور اسی دن منظور کیا گیا + قومی تحریک کے لیئے یہ ایک بڑی کامیابی کی دلیل تھی کہ قسطنطنیہ میں دول متحدہ کے اثر کے باوجود تمام ملک کے نمائندے معاہدہ کو متفقہ طور پر منظور کریں یہ کامیابی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ کیونکہ ابھی دو ماہ بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ ۱۵ رمارچ ۱۹۲۰ء کو برطانی جنرل نے ملنے

سے ماتحت دول متحدہ کی فوج نے شہر پر زبردستی قبضہ کر لیا + جس
کے باعث کئی جانیں بھی تلف ہوئیں + یہ حملہ قومی معاہدہ کی مخالفت
میں سابق وزیر اعظم داماد فرید پاشا کی سازش سے کیا گیا تھا +
اسی شبہہ میں ملنے نے شہر قسطنطنیہ کی ترکی آبادی یعنی استنبول
پر چھاپہ مارا - اور جتنے بھی قومیت پسند افراد مل سکے - ان کو حراست
میں لے کر مالٹا کے برطانی قید خانہ میں بھیجدیا + ان تقریبًا چالیس
افراد میں رؤف بے شامل تھا + جنرل ملنے کی اس چیرہ دستی
سے حمیت کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی + یہ حملہ فرانسیسی قائد اعظم
کی ایما سے ہوا تھا چنانچہ اس واقعہ سے دول متحدہ کو بیحد
نقصان پہونچا + عارضی طور پر قومی تحریک کی رفتار میں یقینًا کمی
واقع ہوگئی - لیکن بالآخر اسی کے باعث اولین جذبات اور بھی
پختہ ہوگئے + اناطولیہ میں اس جابرانہ حراستِ احرار سے بہت
اشتعال پھیل گیا + وہاں کی انقلاب پسند جماعت قسطنطنیہ میں دول
متحدہ کے غاصبانہ قبضہ کو کسی طرح برداشت کرنے کے لئے تیار
نہ تھی - اور یہ دیکھکر کہ سلطان دول متحدہ کے ہاتھوں میں کٹ پتلی

کی طرح ناچ رہا ہے ان کو اور بھی صدمہ ہوتا تھا + سلطان کی کمزور اور شرمناک حالت سے ترکی قومیت کو برابر تقویت ملتی رہی اور قوم کی نظروں میں سلطان متواتر گرتا گیا + قومیت پسند جماعت کے ان افراد نے جو اُس حراست سے بچ گئے تھے۔ سیدھا انگورا کا رُخ کیا اور اپنی پُرانی مجلس کو از سر نو ترتیب دینا شروع کیا۔ چنانچہ ملک میں اب پھر دو مختلف حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ اور انگورا کی مجلس کو پھر باغی تصور کیا جانے لگا + قومی مجلس کا اجلاس ۲۳ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء کو انگورا میں شروع ہوا۔ اور از سر نو "قومی معاہدہ" سے وابستگی کا اعلان نہایت صمیم ارادوں کے ساتھ کیا گیا۔ علاوہ دیگر اقتصادی مسائل کے جن پر بحث کی گئی اس اجلاس کا سب سے وقیع مسئلہ سلطان اور حکومت قسطنطنیہ سے قطع تعلق کرنا تھا + قومی مجلس نے اعلان کیا کہ وہ ۱۵ اور ۱۶ مارچ کی درمیانی خوفناک شب سے کہ جب سلطان اور حکومت نے اپنے غدارانہ طرز عمل سے مغربی اعدار کی امداد کی تھی وہ قوم کے اعتماد کے مستحق نہ نہ رہے تھے +

اس اجلاس میں ملک کے مختلف مقامات سے افراد شریک ہوئے۔ ان کا پہلا کام یہ تھا کہ قیام حکومت کے لئے ایک عاملانہ جماعت کا انتخاب کیا جائے + مصطفیٰ کمال کو صدر اور قائد اعظم منتخب کیا گیا + اس جماعت میں وہ افراد جو مالٹا میں محروس تھے منتخب نہ ہو سکے + آیندہ کے لئے یہ صاف طور پر اعلان کیا گیا کہ دراصل عنان حکومت عوام کے ہاتھوں میں رہنی چاہیئے اور اس مقصد کے لئے یہ قرار پایا کہ عوام ایک مجلس کا انتخاب ہر دو سال کے بعد کیا کریں اور ان میں سے منتخب اشخاص بحیثیت عاملانہ جماعت کے جملہ فرائض حکومت ادا کریں + چنانچہ یہ نئی مجلس ہر حالت سے با اقتدار اور با اختیار تھی اور اس کے تمام افراد قومی تحفظ قائم رکھنے کے لئے متفق تھے +

باب سات
جنگ ترکی و یونانی
سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۲۲ء

مئی سنہ ۱۹۱۹ء میں یونانی سمرنا پر قابض ہو گئے + یونانی چیرہ دستی اور سمرنا پر ان کے بیجا تسلط نے ترکوں کے قومی جوش کو اور بھی بھڑکا دیا۔ آخر کار ترکوں نے اعلان جنگ کر دیا + یہ جنگ جو یونانی غاصبانہ طرز عمل کا فوری نتیجہ تھی سنہ ۱۹۱۹ء کے وسط سے شروع ہو کر سنہ ۱۹۲۲ء تک جاری رہی + مگر ان خونریزیوں میں ترک جانبازوں نے اپنے مفاد کی حفاظت پر قادر ہونیکا بہترین ثبوت دیا + اور اعلان کرنے والوں کا زعم اور پندار۔ زعم باطل اور پندار بیجا سے زیادہ نہ نکلا + یونانیوں کے لئے ایک ایسے ملک میں کہ جہاں

سراسر غیر قوم آباد تھی تسلط قائم رکھنا دشوار امر تھا لیکن اس سے
علاوہ یونانیوں کی جابرانہ حرکات اور جور و تظلم نے خود وہ اثر
کیا کہ ترک یک لخت ان کی شدید مخالفت کے لئے آمادہ ہو گئے۔
یونانی ظلم اور بیرحمی کے سامنے اس علاقہ کے ترک قدم نہ جما
سکے اور وہاں سے اندرونی اناطولیہ کی طرف بھاگنا شروع کیا
اسی کا اثر تھا کہ اندرونی اناطولیہ میں غیظ و غضب کی آگ اور بھڑک
اُٹھی اور عام طور پر اس جماعت کے سامنے ہمدردی کا اظہار ہونے
لگا۔ یونانیوں کے خلاف انتقامی جذبہ ہر دل میں جاگزیں ہو چکا تھا
اب جنگی معرکہ عام ہو گئے چنانچہ ۱۹۱۹ء کے اختتام پر ایشیائی کوچک
میں یونانی فوج کی تعداد اسی ہزار تک پہونچ گئی باقاعدہ ترکی فوج
کی تعداد اس وقت یونانی افواج کے نصف سے زیادہ نہ تھی۔ یونانی
محض ان علاقوں کے قبضہ پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہتے تھے جن کی بابت
دول متحدہ نے منظوری دیدی تھی بلکہ اپنا اثر قائم رکھنے کے لئے وہ
حدود کی مزید توسیع کے خواہاں تھے۔ حالانکہ دول متحدہ کی منظوری
سر بجا عارضی تھی۔ لیکن یونانیوں نے حکومت کی بنیاد ڈالنی شروع

کر دی ۔ چنانچہ سمرنا میں ایک ہائی کمشنر کا تقرر بھی عمل میں آیا + ترکوں پر اپنے دار السلطنت چھن جانے کی ندامت چھا رہی تھی مگر یونانیوں کی بیجا حرکات نے ان کے جذبات کو فی الفور مشتعل کر دیا ۔ ان کے لیئے یہ اور بھی تکلیف دہ بات تھی کہ دو ل نخدہ ۔ یونانیوں کی ناجائز سے ناجائز حرکات کو بھی خاموشی کے ساتھ دیکھ رہے تھے ۔ ہر چند کہ قومی تحریک کے جذبہ نے ترکوں کے دلوں کو متاثر کر دیا تھا بایں ہمہ وہ عاجزی کے ساتھ ترکی کی تقسیم دیکھ رہے تھے ۔ مگر ان واقعات کے بعد قومی تحریک نے ایک عملی صورت اختیار کر لی + عارضی صلح ۱۹۱۸ء کی رو سے ترکی فوج کو ہتھیار ڈالدینے کا حکم ہو چکا تھا + لیکن ان واقعات کے بعد اس حکم کو منسوخ کر دیا گیا + قومی افواج میں معتدبہ اضافہ ہو گیا اور اس کی ترتیب و تنظیم شروع کی گئی + مصطفٰی کمال نے اپنا اثر ایشیائے کوچک میں عوام تک پھیلا دیا وہ انقلابی تحریک کا پیش رو تھا اور جہاں کہیں گیا عوام الناس نے لبیک کہہ کر اس کی پیروی کی + یونانیوں کی چیرہ دستی سے ترکوں کے جذبات مشتعل ہو چکے تھے اور ان کی تنظیم کے لیئے محض ایک ایسی

شخصیت کی ضرورت تھی جو ان کی رہنمائی کر سکے + اب مصطفیٰ کمال نے اس کمی کو پورا کر دیا تھا + یہ امر مسلمہ ہے کہ ایسی حالت میں ہر شخص کے دل میں حب وطنی اور وقار قومی کا جذبہ بہت جلد طاری ہو جاتا ہے اور ہر وہ تحریک کہ جس کا مقصد قومی وقار کا قیام ہو بآسانی کامیاب ہو سکتی ہے + خاصکر اناطولیہ میں اس تحریک کو حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوئی + اس دور کی حالت کا مرقع - خالدہ ادیب خانم نے اپنی مشہور تصنیف "قمیص احمر" میں نہایت خوبی سے کھینچا ہے اور اس کتاب سے اس شدید جذبہ کا اندازہ ہوتا ہے جو عوام میں موجزن تھا +

اس جنگ کا آغاز ترکوں کی جانب سے محض اپنے وطن کی حفاظت کے لئے ہوا - یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ دوسری جانب ملک گیری کی ہوس نے دول یورپ کو دیوانہ بنا دیا تھا اور اسی وجہ سے وہ ترکی کی جنگی طاقت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے تھے + خفیہ معاہدوں کی بنا پر یونانی نے بیجا قبضہ کرنے پر کمر باندھ رکھی تھی اور یہی اس جنگ کی اصل وجہ تھی + لیکن یہ امر بھی نظرانداز

نہیں کیا جا سکتا کہ اس جنگ سے ترکوں کا مدعا اپنی آزادی کا قائم رکھنا تھا۔ اور اس انقلابی کیفیت میں دراصل مغربیت کا اثر نمایاں تھا جو اب دول مغرب ہی کے خلاف رونما ہو رہا تھا +

ترکی کے لئے پرانی مشرقی طرز حکومت ناموزوں ثابت ہو چکی تھی + یورپ نے اپنے جدید خیالات سے ترکی کو بیدار کر دیا تھا + اب ترکی ایک نئے دور کی خواہاں تھی جس میں وہ اپنی قومیت مستحکم بنا سکے اور اپنی ملکی آزادی کو قائم رکھ سکے + ترکی غیر ملکی قیود سے بیزار ہو چکی تھی اور اسی طرح آزاد ہونا چاہتی تھی کہ جیسے اور مغربی ممالک آزاد ہو گئے تھے۔ ترکی کے محکوم صوبجات آزاد سلطنتیں بن چکے تھے اور ترکی کے لئے یہ نہایت ناگوار امر تھا کہ طوق غلامی اب اسکے گلے میں ڈال دیا جائے + ترکی نہایت شدت کے ساتھ ان ممالک کے مقابلہ کے لئے تیار تھی جو اس کی آزادی چھین لینے کے خواہاں تھے ہر ایک ترک اناطولیہ کے حملہ آوروں کی مخالفت میں اپنا خون بہانا فرض سمجھتا تھا + جنگ ترکی انہیں ناگوار واقعات

کا نتیجہ تھی + عوام الناس کی دلی تمنا حصول آزادی اور قومیت
کا برقرار رکھنا تھی اور اس کی راہ میں وہ جان نثار کرنے کے
لئے آمادہ تھے + انہیں وجوہات کی بنا پر نہایت گرم جوشی کے
ساتھ تیاریاں شروع ہوگئیں + مصطفےٰ کمال کو لشکر تیار کرنے میں
چنداں زحمت نہ ہوئی اور ہر جگہ سپاہی اس کی فوج میں بخوشی
داخل ہونے لگے + کرنل بکر سامی نے بھی جو سمرنا کے محاذ پر افسر
اعلیٰ تھا حکومت قسطنطنیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور معہ اپنے
دس ہزار سپاہ کے مصطفےٰ کمال کے ہمرکاب ہوگیا۔ مصطفی کمال
نے بحیثیت قائد اعظم قومی افواج کی سپاہ سالاری اختیار کی + اس
ترکی فوج کی بوقلموں ترکیب قابل غور ہے + اس میں بیشتر سپاہی
وہ تھے جو پرانی فوج سے برطرف کر دیئے گئے تھے اور بالکل
خستہ و پریشان حال تھے + باایںہمہ انہوں نے بخوشی نئی فوج میں
شرکت کی + ان ترک جانبازوں کے ایثار کا اندازہ ان حالات
اور مشکلات سے لگایا جا سکتا ہے جو اس وقت درپیش تھے! ور
جو قومی سے قومی لشکر کو پریشان کر دینے کے لئے کافی تھے +

برہنہ پا اور نیم برہنگی کے علاوہ یہ سر فروش سپاہی اکثر بغیر اسلحہ کے غنیم سے مقابل ہونے پر مجبور رہتے تاہم فوج میں ان کی تعداد برابر بڑھتی گئی + یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ان میں سے متعدد افراد وہ بھی تھے جن کو طلعت پاشا نے جنگ عظیم (۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء) کے دوران میں قید خانوں سے رہا کر دیا تھا تاکہ اناطولیہ کی یونانی آبادی کا قلع قمع کر دیں + ان کے علاوہ کچھ تعداد ان لوگوں کی تھی جو ذاتی مفاد یا لوٹ مار کی غرض سے شریک ہو گئے تھے + عارضی صلح ۱۹۱۸ء کے بعد شاہی لشکر کے بے شمار افسران قسطنطنیہ اور دیگر شہروں میں تنگدستی سے گذار رہے تھے + یہ اندازہ کیا جاتا تھا کہ افواج عثمانیہ میں افسران کی تعداد پچیس ہزار سے زائد تھی جن میں سے بہت سے افسران البانی یا کرد یا عرب تھے + ان افسران میں سے تقریباً پانچ ہزار نے مصطفےٰ کمال کی شرکت کی + الغرض اسی فوج سے مصطفےٰ کمال نے اپنی محبوب وطن کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا تھا +

جنگ ترکی و یونانی کے تین وقیع مراحل ہیں۔ جن میں

سے پہلے میں یونان کو کامیابی ہوئی + اور پچھلے میں دونوں میں باوجودیکہ یونانی فوج نے نہایت سختی اور تندی کے ساتھ حملہ کیا لیکن بالآخر ترکی ہی کا پلہ بھاری رہا + ۱۹۲۲ء کے معرکے فیصلہ کن تھے۔ اور انجام کار ترکی کو کامیابی نصیب ہوئی +

اولین حملہ جون ۱۹۲۰ء کے اختتام پر یونانیوں کیطرف سے ہوا + اس میں یونان کو مکمل کامیابی حاصل ہوئی اور بہت سے نئے مقامات مثلاً بروسہ۔ مدانیہ۔ اسمد وغیرہ پر یونانی قبضہ ہوگیا + یونانی اس فتح کے نشے میں اور بھی مست ہوگئے۔ چنانچہ توسیع مملکت کی خواہش نے مزید زور پکڑا + اس کامیابی کا زور یونانی افواج کے پاس اسباب حرب کی زیادتی تھا چونکہ دول متحدہ نے اسلحہ کا ایک بڑا ذخیرہ یونانیوں کو عارضی صلح ۱۹۱۸ء کے بعد دیا تھا + زمانہ حال کے طریقۂ جنگ میں نقل و حرکت کی آسانی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یونانیوں کے پاس ایک کثیر تعداد میں باربردار گاڑیاں موجود تھیں اور سمرنا سے جانیوالی تینوں ریلوے لائنوں پر بھی انہیں کا قبضہ تھا + مزید براں یونانیو

کے لئے بحری راستہ کھلا ہوا تھا + اور اس لئے ضروری اشیائ
باسانی مہیا ہوسکتی تھیں + اس کے برخلاف ترکی فوج اناطولیہ
کے وسط حصہ میں چاروں طرف سے گھری ہوئی تھی + اور
جو کچھ بھی سامان خورونوش واسباب حرب وہاں مہیا ہوسکتا
تھا - اسی پران کا تمام انحصار تھا + علاوہ ازیں ترک ابھی غیرمنظم
حالت میں تھے + حکومت قسطنطنیہ کی مخالفت بھی برابر جاری
تھی + اور وہ اناطولیہ ریلوے کے محض وسطی حصہ اور اس کی
انگورہ شاخ سے فائدہ اٹھا سکتے تھے + ان کے پاس نہ موٹر
گاڑیاں موجود تھیں نہ اچھی سڑکیں کہ جن سے آمدورفت میں مدد
مل سکتی + اگرچہ ان کے پاس دیگر اسلحہ کافی تھے لیکن وہ توپخانہ
کی قلت بڑی طرح محسوس کر رہے تھے - ترکی افواج نے اپنے
زبردست دشمن کا سخت مقابلہ کیا لیکن تاہم ناکام رہے - اور
جب صورت حال یہ ہو تو کون کہہ سکتا ہے کہ یونانی فتح حیرت
انگیز کامیابی تھی +

اوائل ۱۹۲۱ء میں یونانیوں کو جنگی حالات سے تشویش

شروع ہوئی + دو سبب خاص طور پر پریشان کُن تھے - ایک تو مفتوحہ آبادی کی شورش کے باعث ان کو مشرقی فتوحات پر قبضہ رکھنا دشوار تر ہو گیا + دوسرے ترکی فوج میں روز افزوں ترقی ہونے لگی + چنانچہ فروری ۱۹۲۱ء میں ایک کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی جس میں یونان حکومت قسطنطنیہ اور مصطفیٰ کمال کے نمایندے شریک ہوئے + اس کانفرنس میں دول متحدہ کیجانب سے کچھ تجاویز پیش کی گئیں جو درحقیقت صلحنامہ سیورسے ہی کی ترمیم شدہ شرائط تھیں اور جن کا ماحصل ترکی کو مزید مراعات دینا تھا لیکن مصطفیٰ کمال کی جماعت کو اصولی نقطہ نگاہ سے اب بھی اعتراض تھا چنانچہ انہوں نے ان شرائط کو منظور کرنے سے انکار کر دیا + اس کے بعد دول متحدہ نے یہ دیکھکر کہ ان کی کوشش بے سود ثابت ہوئی مئی ۱۹۲۱ء میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ وہ جنگ ترکی و یونان کے سلسلہ میں غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کریں گے + دول متحدہ کے اس رویہ سے یونانی نہایت برگشتہ ہو گئے - لیکن انہیں اپنی قوت پر اعتماد تھا اور اس لئے انہوں نے وسیع پیمانہ پر جنگ کی بنا رکھی

از سر نو شروع کر دیں۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ لڑائی فوراً ہی چھڑ جائے تاکہ ترک اپنی فوج کی تنظیم نہ کر سکیں + اس مرتبہ یونانیوں کی دلی تمنا تھی کہ انگورہ کو کسی نہ کسی طرح فتح کر لیا جائے تاکہ ترکوں کو وسط اناطولیہ سے نکال سکیں + یونانیوں کا خیال تھا کہ اس کے بعد مفتوحہ علاقہ پر تسلط جمانا آسان کام ہوگا اور مشرقی اضلاع بھی بآسانی قبضہ میں آسکیں گے مصطفےٰ کمال کو خود اس کا ڈر تھا اور اس لئے انگورہ کی محافظت مکمل طریقہ پر کی گئی +

۲۳ مارچ ۱۹۲۱ء کو یونانی دو مختلف محاذ پر ایک ہی وقت میں حملہ آور ہوئے + ان کا مدعا یہ تھا کہ ایک طرف تو قیوم قرہ حصار کو تسخیر کر لیا جائے اور دوسری طرف عسکی شہر کو مغلوب کیا جائے اور اسی طرح دو بڑے ریلوے اسٹیشن ان کے قبضہ میں آجائیں + جس کے باعث ان کا اقتدار تمام ریلوے لائن پر جو قسطنطنیہ سے سمرنا تک جاتی ہے قائم ہو جائے + اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ ترک محاذ سمرنا پر اپنی افواج نہ جما سکتے + یونانی افیوم قرہ حصار کی تسخیر میں کامیاب ہوئے لیکن ان کو جلد واپس ہوتا

پڑا چونکہ عسکی شہر کے معرکہ میں انہیں شکست ہوئی + لیکن یونانی فوج نے پھر کامیابی کے ساتھ پیش قدمی کی اور دریائے سقاریہ پر ۲۴ راگست کو ترکوں سے پھر مڈھ بھیڑ ہوئی + اس مرتبہ مصطفیٰ کمال نے بذات خود ترکی سپاہ کی سالاری کی اور عصمت پاشا کو نائب مقرر کیا + اس جنگ کے دوران میں مصطفیٰ کمال نے متعدد بار گھمسان کے معرکوں میں گھس کر داد شجاعت دی اور ایک مرتبہ بہت شدید طور پر زخمی ہوا + یہ شدید لڑائی تین ہفتہ تک جاری رہی اور دونوں طرف سے برابر کا مقابلہ رہا + بالآخر یونانیوں کو ہٹنا پڑا اور ۱۶ ار ستمبر کو واپسی کا عام حکم دیدیا گیا۔ چنانچہ یونانی ترکی دیہات کو جلاتے ہوئے ۲۳ ر ستمبر کو اپنی پرانی محاذ پر پہنچ گئے + ہرچند کہ یہ فیصلہ کن معرکہ نھا لیکن یونانی فوج پر بہت بُرا اخلاقی اثر ہوا + اور ترکوں کے دل اور بھی بڑھ گئے + بظاہر یہ جنگ سقاریہ زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی لیکن ضرور ہے کہ آیندہ تاریخ میں ایک اہم واقعہ سمجھی جائے۔ چونکہ اس کی وجہ سے حالات کی رو دفعتاً بدل گئی + درحقیقت جنگ ترکی و یونانی میں اس معرکہ

کے بعد تمام حالات دگرگوں ہو گئے + جنگ سقاریہ کے بعد ایک سال تک کم وبیش امن رہا اور اس دوران میں ترکی کو اپنی فوج کی پوری طرح تنظیم کرنیکے لئے نہایت مناسب موقع میسر آگیا +
فتح سقاریہ کے بعد فوراً ہی مصطفےٰ کمال پاشا انگورہ کو واپس آیا + یہاں پر قومی انجمن نے اسے وہ ذی شان عزت بخشی کہ جس کا وہ پوری طرح سے مستحق تھا اور اس کو "الغازی" کے خطاب سے سرفراز کیا + اس سرفرازی کے شکریہ میں مصطفےٰ کمال نے تقریر کرتے ہوئے قوم پسند جماعت کا جنگ یونان سے متعلق نقطہ نظر اس طرح بیان کیا:-

"بحیثیت صدر جمہوریت میں آپ کے سامنے صاف طور پر اعلان کرتا ہوں کہ ہمارا مدعا صلح اور آشتی قائم کرنا ہے نہ کہ جنگ اور میرا ذاتی خیال ہے کہ ہمارے اس مقصد کے حصول کے لئے کوئی بات مانع نہیں + اگر یونانی عساکر اس مغالطہ میں ہیں کہ وہ ہم سے ہمارے جائز حقوق چھین سکتے ہیں - تو میں یہ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ فاش غلطی کر رہے ہیں

یہ قدرتی امر ہے کہ ہم اپنے ملک اور قوم کی حفاظت کے لئے
اپنی جان تک قربان کر دیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اس کے
علاوہ ہم کوئی دوسرا پہلو اختیار ہی نہیں کر سکتے + حاضرین۔
یاد رکھیئے گا کہ ہم اس وقت تک چین نہ لیں گے کہ جب تک ہمارے
تمام ملک سے دشمن کی فوج کا ایک ایک فرد نہ نکل جائے +
بہرحال ایک سال تک کوئی جنگی معرکہ وقوع میں نہ آیا اور اس
دوران میں ترکی فوج کی تنظیم برابر جاری رہی + یونانی بھی
ایشائے کوچک میں اپنی حالت کو استوار کرنے میں متواتر
کوشاں رہے +

اسی دوران میں سیاسی حالات بھی بہت تیزی کے
ساتھ تغیر پا رہے تھے اور مجموعی حیثیت سے ترکی کی قومی
جماعت کے لئے مفید ثابت ہو رہے تھے + جنگ سقاریہ کا
اثر بہت معنی خیز ہوا + تمام دنیا کو یہ ماننا پڑا کہ ترکی میں اصل حکومت
قومی انجمن کے ہاتھ میں تھی + گفت وشنید کے لئے دول متحدہ
کی جانب سے پیرس میں پھر ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ لیکن اس

کی شرائط کو پھر نامنظور کر دیا گیا +

فرانس نے حالات کی اصلیت کا بہت جلد اندازہ کر لیا اور چونکہ فرانس یونانی خواہشات سے متفق نہ تھا۔ اس لئے لندن کانفرنس (فروری و مارچ ۱۹۲۱ء) کے موقع پر ہی اس نے حکومت انگورہ سے براہ راست گفت و شنید شروع کر دی تھی + اور جنگ سقاریہ کے بعد اپنے نمائندے موسیو فرینکلن بوئیلن کو انگورا روانہ کیا تاکہ مابین فرانس و ترکی ایک علیحدہ صلح نامہ قرار دیا جائے + چنانچہ ایک معاہدہ قرار پایا اور اس پر ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو دستخط کر دیئے گئے + برطانیہ عظمی کو اس معاہدہ میں فرانس سے شکایت پیدا ہوئی چونکہ یہ بغیر ان کی رضامندی اور اطلاع کے وقوع میں آیا تھا +

اس معاہدہ کی رو سے جو مختلف ناموں سے موسوم ہوا تھا فرانس نے شام میں ایک نئی سرحد تجویز کی جو ترکی کے لئے صلحنامہ سیورے کے شرائط کے مقابلہ میں بہت فائدہ مند تھی + فرانس نے سلیشیا سے بالکل دست بردار ہونا قبول

کیا اور اس دست برداری کے عوض میں فرانس کو وسیع
تجارتی مراعات دیئے گئے + بقول موسیو براینڈ سیلیشیا میں اسی
ہزار نفوس فرانسیسی فوج کے موجود تھے اور ان کے مدمقابل
اسی قدر تعداد ترکوں کی بھی تھی + اس لئے سیلیسیا سے فرانسیسی
افواج ہٹا لینے کے یہ معنی تھے کہ ترکی فوج میں اسی ہزار سپاہ
کا اضافہ ہو جائے اس کے علاوہ فرانسیسی فوج نے واپس
ہوتے ہوتے اس قدر اسلحہ اور سامان ترکوں کے لئے چھوڑ
دیا کہ چالیس ہزار فوج کے لئے کافی تھا + ان واقعات سے
یہ صاف ظاہر تھا کہ فرانس نے حکومت انگورہ کو جائز تسلیم کر لیا
تھا + برطانیہ اس وقت تک قسطنطنیہ کی عاجز حکومت کا ساتھ دے
رہی تھی + اور اس لحاظ سے فرانس نے برطانیہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔
چنانچہ یہ امر اب مخفی نہ تھا کہ مسئلہ ترکی پر دول متحدہ آپس میں
متفق نہ تھے + اس معاہدہ کے بعد فرانس نے جنگ ترکی و یونان
میں مداخلت بند کر دی + جون ۱۹۲۱ء میں اس سے قبل کہ
فرانسیسی فوج سیلیشیا سے واپس ہوتی + اٹلی نے بھی نئے حالات

دیکھکر اپنی فوج واپس بلالی اور مصطفیٰ کمال سے ایک دوستانہ
اقرارنامہ طے کرلیا + اس کے علاوہ ۱۳ر مارچ ۱۹۲۲ء کو اٹلی
نے حکومت قسطنطنیہ سے بھی ایک علیحدہ معاہدہ طے کیا اور
بعد آزاں فرانس کی مانند اٹلی بھی اس جھگڑے سے دست
بردار ہو گئی + یہ امر بیان ہو چکا ہے کہ مارچ ۱۹۲۲ء میں پیرس
میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں شرائط سیورے کو ترمیم
کے بعد ترکوں کے سامنے پیش کیا گیا + ۲۲ مارچ کو دول متحدہ
کی جانب سے ایشیائے کوچک میں عارضی صلح قائم کرنے
لئے شرائط انگورہ اور ایتھنز روانہ کی گئیں + چار دن کے بعد
جدید تجاویز پیش ہوئیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ عارضی صلح
کے بعد یونانی فوج چار ماہ کے اندر ایشیائے کوچک کو خالی
کر دے اور اس تمام علاقہ پر ترکی حکومت کو قبضہ دیدیا جائے +
شرائط کو ایتھنز (یعنی یونانی) اور حکومت قسطنطنیہ نے تسلیم کرلیا
لیکن یوسف کمال بے نے جو حکومت انگورہ کے وزیر خارجہ
تھا ۔ مطالبہ کیا کہ یونانی فوج فوراً ہی مراجعت شروع کر دے

اور چار ماہ کے اندر ایشیائے کوچک بالکل خالی کر دیا جائے۔ اور یہ کہ اس شرط کی تکمیل کے بعد ہی عارضی صلح کی جا سکتی ہے لیکن دول متحدہ نے عارضی صلح کو مقدم قرار دیا۔ چنانچہ یہ گفت و شنید بھی بیکار ثابت ہوئی + یہ دیکھکر یونانیوں نے اب پھر زور بازو آزمانا چاہا +

۱۷ جولائی ۱۹۲۲ء کو یونانی ہائی کمشنر مقیم سمرنا نے شاہی احکام کے مطابق اعلان کیا کہ مقبوضات ایشیائے کوچک ایک علیحدہ خود مختار حکومت تصور کئے جائیں گے اور یونان کے زیر اقتدار ہوں گے + حکومت انگورہ نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اور مخالفت کے لئے قومی تیاریاں شروع کر دیں + یونان پہلے ہی سے تیار تھا۔ چنانچہ قسطنطنیہ پر پھر قبضہ کرنے کے لئے آمادگی ظاہر کی اور اس مقصد کے لئے تھیریس میں افواج کا اجتماع شروع کر دیا + مگر مسٹر لارڈ جارج نے دول متحدہ کی طرف سے اعلان کیا کہ وہ قسطنطنیہ پر قبضہ کی اجازت نہ دیں گے +

اس جنگ کی آخری لڑائی ۱۸ راگست ۱۹۲۲ء کو شروع ہوئی + معمولی معرکہ بروسہ اور اس کے قریب وقوع میں آئے + بعد آزاں عصمت پاشا نے ۲۶ راگست کو افیوم قرہ حصار پر حملہ کیا۔ یہاں پر بہت گھمسان کی لڑائی ہوئی اور آخرکار یونانی فوج کو سخت ہزیمت کے ساتھ پسپا ہونا پڑا + ترکی فوج نے تعاقب کیا کہ اور ۲۹ راگست تک وہ اپنی محاذ سے چالیس کلو میٹر آگے بڑھ گئے + اس کے بعد یونانی فوج کے قدم نہ جم سکے + عشاق پر پھر جنگ آزمائی ہوئی لیکن ترکوں نے یونانی صدر مقام پر چھاپہ مارا اور یونانی جنرل ٹرکوپیس کو معہ ذاتی عملہ کے گرفتار کر لیا + یونانی فوج کے لئے اس کے بعد چارہ کار باقی نہ رہا تھا + ان کی طاقت زائل ہو چکی تھی اور فوجیں منتشر ہو رہی تھیں ایسی حالت میں یونانی فوج کو سب سامان وہیں چھوڑنا پڑا اور وہ محض اپنی رائفلیں اپنے ساتھ لے کر واپس ہو گئے + فیوضی پاشا نے ان کا تعاقب کیا اور ان کو کہیں دم لینے کا موقع بھی نہ دیا + تاہم یونانی فوج جس

طرف سے بھی گذری۔ ترکی دیہات کو جلاتی ہوئی چلی گئی اور اپنی ہزیمت اور شکست کی یادگار صرف خاکستر آبادیوں اور اٹھتے ہوئے دھوئیں میں چھوڑ گئی +

جنگ ختم ہو چکی تھی اور یونانی باشندے رفتہ رفتہ ملک خالی کر رہے تھے + ترکوں نے آخرکار سمرنا پر قبضہ کر لیا اور ملک یونانی باشندوں سے بالکل خالی ہو گیا + امن و امان قائم کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ لیکن اسی دوران میں سمرنا میں سخت آتش زدگی وقوع میں آئی جس سے تقریباً نصف شہر جلکر خاک ہو گیا + کچھ لوگوں نے اس کو نیک فال سمجھا اور اس آتش زدگی کو "دیار دغنا باز" کی چتا تصور کیا + ان کے خیال کے مطابق قومی جماعت کو جنگ میں بھی کامیابی نصیب ہوئی اور اس آتش زدگی نے بھی بیگانہ و مضر خس و خاشاک کو جلا کر سمرنا کو پاک کر دیا۔ کیونکہ شہر کے اس حصہ میں جو جلکر خاک ہو گیا تھا تمام تر اہل یورپ ہی آباد تھے اور ترکی آبادی کو مطلقاً کوئی گزند نہ پہنچا تھا +

ان واقعات کو دیکھکر تمام دنیا انگشت بدنداں تھی۔ یونانیوں کی مدد کے لیئے جملہ ذرائع مہیا کیئے جا رہے تھے۔ خاصکر امریکہ ان کو بہت مدد دے رہا تھا۔ لیکن ترک بھی خاموش نہ تھے۔ مصطفےٰ کمال نے مطالبہ کیا کہ یونانی مشرقی تھیریس کو بھی خالی کر دیں۔ جیسا کہ ترکوں نے اپنی قومی معاہدہ میں تجویز کیا تھا۔ اس مطالبہ کو زوردار بنانے کے لیئے۔ قومی فوج کو شمال کی جانب ابنائے باسفورس کی سمت میں حرکت دی گئی تاکہ تھریس میں پہونچکر وہاں سے بھی یونانیوں کو اِس طرح نکالدیا جائے جس طرح کہ ایشیا سے۔ لیکن ابنائے باسفورس پر پہنچکر ترکوں کے لیئے ایک عجیب مشکل کا سامنا ہوا۔ برطانیہ نے چناق نے پر ترکوں کی پیش قدمی کو بالکل روک دیا۔ کیونکہ جب دول متحدہ نے جنگ ترکی و یونانی کے متعلق اپنے غیر جانب دارانہ رویہ کا اعلان کیا تھا۔ اس وقت کچھ علاقہ کو غیر جانبدار بھی قرار دیدیا تھا جس میں ابنائے باسفورس اور درہ دانیال کے ہر دو جانب کا علاقہ شامل تھا چنانچہ اس

خطہ پر فریقین میں سے کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی + جولائی
۱۹۲۲ء میں برطانی جنرل ہرنگیٹن نے یونانی فوج کو اس خطہ
میں مداخلت کرنے سے روکا تھا۔ چنانچہ وہی رویہ ستمبر میں ترکوں
کی جانب اختیار کیا گیا۔ لیکن مصطفےٰ کمال نے اپنے مطالبہ
پر اصرار کیا اور یونانیوں کے تعاقب میں اپنی فوج کو تھریس
میں پہنچانا چاہا + بصورت مخالفت مصطفےٰ کمال نے اپنی فوج
اسمد پر جمع کرنی شروع کی اور ساتھ ہی ساتھ دول متحدہ کی
سپاہ جو چناق پر تھی اس کا مقابلہ شروع کر دیا + واقعات نے
بہت ہی نازک حالت اختیار کر لی تھی برطانیہ اور ترکی افواج
میں لڑائی چھڑ جانے کا ہر لحظہ خیال تھا + فرانس کے طرز عمل
سے یہ حالت اور بھی نازک ہو گئی تھی۔ کیونکہ وعدہ کے خلاف
موسیو پانیکارے نے اپنی تمام فرانسیسی فوج ہٹا لینے کا ارادہ
ظاہر کیا چنانچہ ۱۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو فرانسیسی اور اطالی فوج دونوں
جزیرہ نما گیلی پولی کی طرف چلی گئیں + لیکن مسٹر لائڈ جارج اور
لارڈ کرزن اپنی بات پر اڑے رہے اور انھوں نے چناق

کی طرف مزید فوج اور بحری بیڑہ روانہ کر دیا اگرچہ اسکے
ساتھ ہی ترکی سے درخواست بھی کی کہ وہ چناق سے ہٹ
جائیں مبادا کہیں کوئی واقعہ نہ پیش آجائے کہ جس سے جنگ
کی آگ ازسرنو بھڑک اٹھے + آخر کار ۳ر اکتوبر کو برطانی جنرل
ہیرنگٹن معہ دیگر نمائندگان دول متحدہ عصمت پاشا کے پاس
مدانیہ بغرض گفت وشنید گئے۔ اور طویل حیل وحجت کے بعد
بالآخر ۱۱ر اکتوبر کو عارضی صلح قرار پائی + دول متحدہ نے ترکی
کے کم وبیش تمام مطالبات مان لیئے + یونانیوں کو فی الفور
مشرقی تھریس خالی کرنا پڑا اور ترکی کو تمام صوبہ تھریس دریا
میرٹسا تک دیدیا گیا + اور اندرونی نظم ونسق قائم کرنے کے
لیئے آٹھ ہزار پولس کے سپاہی بھی تھریس میں فوراً لیجانے کی
اجازت دیدی گئی + چنانچہ دول متحدہ کی کوششوں کے
باوجود ترکی کو یورپ میں مقبوضات مل گئے + یونانی خواہشات
کا بھی اس طرح خاتمہ ہو گیا + جنگ ترکی ویونان مکمل طور پر ختم
ہو گئی اور ترکوں کو اپنے قومی معاہدہ کے مطابق تمام متنازعہ

فیہ علاقوں پر قبضہ ل گیا + یہ واقعات مسٹر لائڈ جارج کیخلاف
توقع رونما ہوئے اور انہوں نے اپنے طرز عمل کی ناکامی
دیکھ کر شاہنشاہ ملک معظم کے حضور میں ۱۹ ر اکتوبر کو استعفار
پیش کردیا + یہ مسلمہ امر ہے کہ مشرق قریب کے جھگڑوں نے
ترکی کو بجائے ختم کرنے کے اس کو ایک نئی زندگی عطا کی

باب آٹھ

اجتماع لوزان اور صلح نامہ

مُدانیہ کی گفت و شنید کا مقصد محض عارضی صلح کا قائم کرنا تھا + ترکی کے متعلق تمام مسائل طے کرنے کے لئے ایک کانفرنس کا قیام لازمی تھا + چنانچہ اس مدعا کے لئے لوزان کانفرنس ۔ نومبر ۱۹۲۲ء میں منعقد ہوئی ۔ اس کانفرنس کی شرکت کے لئے اطلاعی خطوط قسطنطنیہ اور انگورہ ہر دو جگہ روانہ کئے گئے تاکہ یہ دونوں حکومتیں اپنے نمایندے بھیج سکیں لیکن حکومت انگورہ اسپر معترض ہوئی کہ قسطنطنیہ کی شاہی طرز حکومت کا خاتمہ ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء کو ہوچکا ہے اس لئے وہاں سے کوئی شخص قوم کی نمایندگی کا استحقاق نہیں رکھتا + اسی کے باعث کابینہ قسطنطنیہ ۴ نومبر ۱۹۲۲ء کو مستعفی ہوگئی اور سلطان وحید الدین بھی ۱۷ نومبر کو قسطنطنیہ سے روانہ ہوگئے + چنانچہ اس کے بعد

قسطنطنیہ کی حیثیت دارالسلطنت کی نہ رہی اور دو مختلف حکومتوں کی رقابت جو مارچ ۱۹۲۰ء سے جاری تھی۔ وہ بھی ختم ہوگئی + لوزان کانفرنس کا افتتاحی جلسہ ۲۰ نومبر ۱۹۲۲ء کو منعقد ہوا+ لارڈ کرزن نے بحیثیت وزیر خارجہ برطانیہ کی نمائندگی کی اور اسی حیثیت سے عصمت پاشا نے بھی شرکت کی۔ وہ انگورہ کی حکومت کے وفد کا سرگروہ تھا + کم وبیش تین ماہ تک طویل بحث ومباحثہ جاری رہا۔ لیکن ۴ فروری ۱۹۲۳ء کو دفعتاً یہ گفت وشنید ختم ہوگئی اور لارڈ کرزن انگلستان چلا گیا + عصمت پاشا بھی انگورہ کو واپس ہوا اور وہاں پہنچ کر اس نے گفت وشنید کی ناکامی کا اعلان کیا لیکن تمام قوم نے اس پر آفرین کہا اور اپنے مطالبات میں زیادہ سختی سے زور دینے کی ترغیب دی + اس دوران میں مدانیہ کی عارضی صلح پر فریقین قائم رہے + لوزان کانفرنس از سر نو ۲۳ اپریل ۱۹۲۳ء کو شروع ہوئی لیکن لارڈ کرزن کی بجائے سر ہوریس رمبولڈ برطانی ہائی کمشنر متعینہ قسطنطنیہ نے شرکت کی اور انگورہ سے عصمت پاشا

نے شرکت کی۔ مزید تین ماہ تک گفت وشنید ہوتی رہی ترکی
وفد نہایت سختی کے ساتھ اپنے قومی معاہدہ کی شرائط پر جار رہا۔
حدود ملک۔ تنسیخ مراعات بیرونی قرضہ جات اور دیگر قومی
مفاد کی شرائط پر ترکی وفد نے اپنے مطالبات میں سر مُو فرق
نہ آنے دیا اور بالآخر ۲۴ر جولائی ۱۹۲۳ء کو صلحنامہ پر دستخط
کر دیئے گئے۔ برطانیہ کی جماعت سے صلحنامہ کی تکمیل ۱۵ اپریل
۱۹۲۴ء کو عمل میں آئی۔ صلحنامہ کی سب سے وقیع شرائط غیر
ملکی افراد کی رہائش اور ان کے کاروبار اور مابین ترکی و
یونان تبادلہ آبادی کے متعلق تھیں۔ ترکی کے حدود مقرر کئے
گئے۔ عثمانیہ قرضہ جات عامہ کی ادائیگی کا فیصلہ کیا گیا اور سلسلہ
مراعات ونظام ملت کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔ ان موضوعات کا
زیادہ وضاحت سے بیان کرنا ضروری ہے اور آئندہ ان
پر بالتفصیل لکھا جائے گا لیکن یہاں اتنا کہہ دینا لازمی ہے
ہے کہ ترکی کو اناطولیہ کا مکمل علاقہ اور یورپ میں بھی ایک وقیع
حصہ مل گیا۔ قومی معاہدہ کی رو سے کم وبیش تمام وہ علاقہ جات

جن کو مصطفیٰ کمال واپس لینے یا بچانے کی کوشش کر رہا تھا+
اب ترکی سے مقبوضات مان لیئے گئے +

یورپ میں جدید تقسیم کی بنا پر ترکی کو تمام مشرقی تھریس معہ ایڈریانوپل مل گیا اور اس طرح ترکی کا یورپ میں قبضہ جو گذشتہ دس سال کی متواتر جنگ سے معرض خطر میں تھا۔ قائم رہا + مدبران یورپ کی کوشش کے باوجود کہ ترکوں کو یورپ سے بالکل نکال دیا جائے ترکی کا قیام وہاں برقرار رہا + قسطنطنیہ جو صلحنامہ سیورسے کی رو سے بین الاقوامی انجمن کے ماتحت ہونا چاہیئے تھا اب نئے معاہدہ کے مطابق سلطنت ترکی کا علاقہ اور اس کا جزو لاینفک قرار پایا + قسطنطنیہ سے دول متحدہ کی افواج ہٹالی گئیں اور یہ ترکی فوج کا مرکز بن گیا + ہرچند یہ شہر اب دارالسلطنت نہیں لیکن سیاسی اور اقتصادی حالت سے اب بھی نہایت درجہ اہمیت رکھتا ہے + ترکی کی جنوبی حدود میں بھی کوئی خلل نہ آیا بلکہ فرانس و ترکی معاہدہ کی بنا پر جو ۲۰ ۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو وقوع میں آیا تھا۔ سرحد قائم

کر دی گئی + فرانس نے سلیشیا واپس دیدیا اور بغداد ریلوے بھی ترکی کے قبضہ میں آگئی۔ لیکن شام بدستور فرانس ہی کے زیر اثر رہا + جنوب مشرق میں جہاں عراق کی نئی سلطنت برطانیہ کے زیر اثر ظہور میں آچکی تھی۔ سرحد کے متعلق فیصلہ کو ملتوی کر دیا گیا۔ کیونکہ اسپر ترکی و برطانیہ کے خیالات بالکل متنازع تھے +
عراق اور ترکی دونوں ولایت موصل کو اپنے حدود میں شریک کرنا چاہتے تھے + اس کے باعث مسئلہ موصل جس نے بین الاقوامی اہمیت اختیار کر لی تھی تین سال تک برابر زیر بحث رہا + قومی معاہدہ کے مطابق علاقہ کردستان کو بالکل غیر مشروط طریقہ پر ترکی میں شامل کر دیا گیا + کرد بیشتر خانہ بدوش اقوام سے ہیں جن کو ترکی نسل سے کوئی لگاؤ نہیں اور چونکہ صلحنامہ سیورے کی رو سے کردستان کو علیحدہ خود مختار سلطنت بنا دینے کا خیال تھا۔ اس لئے کردستان میں ایک بے چینی سی پھیل گئی جس کا نتیجہ بالآخر ۱۹۲۵ء میں اہل کردستان کی بغاوت ہوا لیکن بہر حال کردستان ترکی مقبوضہ ہی رہا۔ غالبا قومی تحریک کی سب سے بڑی کامیابی

ہے کہ مدت مدید کی دیرینہ مراعات اور نظام ملت کا یک لخت خاتمہ ہوگیا اور چنانچہ اس طرح سے غیر ملکی اقتدار جو ترکی کی اندرونی زندگی پر صدیوں سے غالب تھا۔ معدوم ہوگیا + تقریباً تمام مطالبات جنکا اعادہ بار بار قومی معاہدہ میں کیا گیا تھا پورے ہوچکے تھے شاید تاریخ عالم میں یہ واحد مثال ہے کہ جس میں ایک مفتوح قوم نے اپنے ویران خانہ سے اٹھکر دنیا کے طاقتور ترین اقوام کا کلہ بہ کلہ مقابلہ کیا اور اپنے سرفراز فاتحین کو سرنگوں کرکے ہر قومی مطالبہ کو پورا کردیا + صلح نامہ لوزان میں سوائے مسئلہ موصل کے باقی سب جھگڑوں کا تصفیہ ہوگیا تھا۔ اور موصل کے متعلق مزید بحث اس لئے ملتوی کردی گئی تھی کہ اور فیصلہ شدہ امور اس کی وجہ سے نہ رُکے رہیں + جنگ کے فوراً بعد جب پہلی مرتبہ پیرس کانفرنس ۱۹۱۹ء میں صلح قائم کرنے لئے منعقد ہوئی تھی۔ اس وقت ترکی کیحالت نہایت خستہ تھی اور دول متحدہ اپنی فتح کی امنگ میں مبالغہ آمیز تجاویز سوچ رہے تھے۔ لیکن جوں جوں تاخیر ہوتی گئی ترکی

میں غیرت کے آثار ترقی کرتے گئے اور آخر کار نتیجہ دگرگوں ہو گیا۔ اگر صلحنامہ سیورے ایک سال قبل پیش کیا جاتا اور اس کی تعمیل فوراً ہی کردی جاتی تو آج ترکی یہ ترکی نہ ہوتی اور خدا معلوم اس ملک کی آیندہ تاریخ کن الفاظ میں لکھی جاتی۔ تاخیر کے باعث دول متحدہ میں خود رشک پیدا ہو گیا اور ہر طاقت محض اپنا فائدہ ہی نہ چاہتی تھی بلکہ دوسرے کی ترقی کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتی تھی + جرمنی کے مشترکہ خطرہ سے نجات ملتے ہی ہر ایک طاقت اپنے اپنے مفاد کے لئے کوشاں ہو گئی + لوزان کانفرنس میں دول متحدہ کے تمام نمایندے متفق الخیال نہ تھے اور اسی وجہ سے ترکی کے مطالبات یکے بعد دیگرے ماننے پڑے + اس کامیابی کا سہرا سب سے پہلے عصمت پاشا کے سر ہے جو اپنے مطالبات پر سختی اور ضد کے ساتھ اڑا رہا + اور تو اور یہ کہا جاتا ہے کہ عصمت پاشا نے اپنے بہرہ پن سے بھی فائدہ اٹھایا + وہ اپنی کہے جاتا تھا اور مخالف تجاویز کو ان سنی کر دیتا تھا گویا کہ قدرتاً معذور تھا۔

عصمت پاشا کی حوصلہ افزائی۔ صدر جمہوریہ اور قوم متواتر کر رہے تھے کہ مطالبات کو حرف بحرف پورا کیا جائے۔ چنانچہ عصمت پاشا کی آواز در اصل تمام قوم کی متفقہ آواز تھی + اب ترکی مفتوح قوم نہ تھی بلکہ یونان کو شکست دینے سے اس کا وقار اور قوموں کی نظروں میں دوبارہ جم چکا تھا اگر سیورے کا صلح نامہ برقرار رہتا تو وہ ترکی کی موت کا پیغام ہوتا۔ لیکن لوزان کانفرنس میں نہ صرف ترکی نے از سر نو زندگی پائی بلکہ اپنی آزادی اور اقتدار کا سکہ پھر جما دیا۔ اور اس امر کی شہادت میں متعدد سلطنتوں نے صلحنامہ لوزان پر دستخط کیے +

یونان شکست کھا کر پسپا ہو چکا تھا۔ اس کی اقتصادی حالت پہلے ہی خراب تھی اور اب تقریباً دس لاکھ نفوس مشرقی تھریس اور ایشیائے کوچک سے بھاگ کر وہاں اور پہنچ گئے تھے + یونان میں سیاسی حالات جلد تبدیل ہو رہے تھے + دسمبر ۱۹۲۰ء میں شاہ قسطنطین کو دوبارہ

تخت پر بٹھایا گیا تھا لیکن ۱۹۲۴ء میں اس کو اپنے لڑکے جارج
دوئم کے حق میں تخت چھوڑنا پڑا + کچھ ہی عرصہ کے بعد ایک
اور انقلاب ظہور پذیر ہوا + یونان میں بادشاہت کا خاتمہ
ہوگیا اور اس کی جگہ جمہوریت قائم ہوگئی + ترکی بھی اندرونی
انتظامات میں مشغول تھی + اس کو غیر ملکی دخل درمعقولات
سے آخر کار نجات مل چکی تھی + ترک اس سکون کے زمانہ میں
امن وامان قائم کرنے کے خواہاں تھے اور ایک ایسی طرز
حکومت کی بنیاد ڈالنا چاہتے تھے کہ جس کے سایہ میں ملکی
تمدن و معاشرت اور صنعت وحرفت کو جلد سے جلد ترقی
ہو سکے + ترکی کی بین الاقوامی حالت میں یہ یک لخت تبدیلی
بالضرور تحیّر خیز ہے لیکن علاوہ اندرونی واقعات کے اس
کے دو بڑے وجوہ ہیں۔ اولاً دول متحدہ کا ایک دوسرے
سے رشک اور دویماً سویٹ جمہوریت کا وعدۂ امداد + بحیرہ
روم اور ساحلی ممالک کے متعلق برطانیہ اور فرانس کی رقابت
کم از کم ۱۷۹۸ء سے ضرور ہے کہ جب نپولین مصر پر حملہ آور ہوا

تھا + ۱۸۸۲ء میں جب برطانیہ نے مصر پر قبضہ کر لیا تو اس رقابت میں اور اضافہ ہو گیا اور اسی طرح واقعہ فاشودہ(۱) کے بعد تعلقات میں مزید بدمزگی پیدا ہو گئی + بالآخر ترکی کے بیشتر عربی صوبجات پر برطانیہ کا اثر قائم ہو جانا فرانس کو سخت ناگوار گذرا + چونکہ یہ امر خفیہ اقرار نامہ مئی ۱۹۱۶ء کے خلاف تھا + فرانسیسی حکام اور فرانسیسی اخبارات کے نقطۂ نگاہ سے یہ مسلمہ امر تھا کہ بحیرہ روم اور ساحلی ممالک میں ان کا مقابلہ دراصل فاتح برطانیہ سے تھا نہ کہ مفتوح جرمنی سے + ان کے خیال کے مطابق اسی نظریہ کی تصدیق عارضی صلح کے بعد فوراً ہی ہو گئی کہ جب دول متحدہ کی جانب سے آبنائے باسفورس پر قبضہ کیا گیا تو برطانیہ بیڑے کی طاقت زیادہ تھی۔ علاوہ ازیں

---

(۱) فاشودہ۔ تقریباً ساڑھے چار سو میل خرطوم سے جنوب کی طرف مصر میں واقع ہے + لارڈ کچنر کے بعد یہاں سے فرانسیسیوں کو علاقہ خالی کر دینا پڑا تھا۔ جس کے باعث انگلستان اور فرانس میں اس وقت کسی قدر کشیدگی ہو گئی تھی +

فرانس کو ایک اور اعتماد آزما شہادت بھی جلد ہی مل گئی۔ لائڈ جارج۔ وزیر اعظم برطانیہ کی اجازت سے یونانی فوج۔ ترکی کے مقبوضات کو اپنے تسلط میں لا رہی تھی اور یونانی کھلم کھلا برطانیہ کو یا کم از کم برطانوی وزیر اعظم کو اپنا مددگار سمجھ رہے تھے۔ چنانچہ فرانس کو خدشہ تھا کہ اگر وہاں یونانی قبضہ برطانیہ کی مدد سے قائم ہوا تو بمقابلہ دیگر سلطنتوں کے۔ ان ممالک میں برطانوی اثر زیادہ رہے گا۔ یہ سراسر فرانس کی خواہش کے خلاف تھا۔ ادھر ترک سیلیشیا میں فرانس کو برابر دبا رہے تھے اس لئے فرانس نے مزید جنگ سے بچنے اور یونانی رشک کی وجہ سے انگورہ حکومت سے براہ راست گفت و شنید شروع کر دی اور جنگ سقاریہ کے بعد اکتوبر ۱۹۲۱ء میں مابین فرانس و انگورہ اقرار نامہ طے پا گیا۔

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اس واقعہ سے ترکوں کو بہت مدد ملی اور وہ یونان کے خلاف مزید فوج لا سکے۔ اسی طرح چناق سے بھی فرانسیسی فوج ہٹا لی گئی۔ حالانکہ وہاں ترک۔ انگریزی فوج پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اٹلی پر بھی رشک و حسد

غالب آچکا تھا۔ جرمنی کی شکست کے بعد اٹلی چاہتی تھی کہ وہ دیگر بڑی سلطنتوں کی ہمسری کر سکے لیکن جب مخالف آثار نظر آئے تو فرانس سے بھی قبل اس نے انگورہ کی جانب صلح کے لئے ہاتھ بڑھایا اور جب فرانس نے اس کا تتبع کیا تو وہ ہمیشہ فرانس سے سبقت لے جانے میں کوشاں رہی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو یونانیوں کو برطانیہ سے اسقدر مدد نہ ملی جتنی کہ ان کو توقع تھی اور دوسری طرف ترکوں کو برطانیہ ہی کے ساتھیوں سے ایک گونہ مدد ملتی رہی۔ لوزان کانفرنس کے متعلق فرانس کو شکایت ہے کہ "مراعات" اور ترکی کے بیرونی قرضہ جات عامہ پر برطانیہ نے اس کی واجب طرفداری نہ کی لیکن ان واقعات کے بعد جو ابھی لکھے جا چکے ہیں یہ کوئی زیادہ تعجب خیز بات نہ تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اناطولیہ کی حکومت اور اور قوم پسند جماعت کو دول متحدہ کا متفقہ طور پر مقابلہ ہی نہیں کرنا پڑا۔

قومی معاہدہ میں علاوہ دیگر مقاصد کے مصطفےٰ کمال

اور اس کی جماعت نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ وہ مشرقی تھریس پر قبضہ اور قسطنطنیہ کی محافظت کرنا چاہتے ہیں۔ اس اعلان کے بعد سوویٹ جمہوریت کو یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ ترکی کی معاونت ان کے لئے اپنی حفاظت کا بہترین طریقہ ہے۔ مارچ ۱۹۲۱ء میں جمہوریہ سوویٹ اور ترکی کے درمیان ایک معاہدہ قرار پایا۔ جو یوسف کمال بے۔ وزیر خارجہ انگورہ کی محنت کا نتیجہ تھا۔ اس معاہدہ کی رو سے جمہوریہ سوویٹ نے انگورہ کی قومی حکومت کو جائز حکومت تسلیم کیا اور قومی معاہدہ کے مطابق ترکی سلطنت کی حدود کو جائز حدود تسلیم کر لیا۔ چنانچہ روس سے ترکی کو برابر مدد ملتی رہی لیکن ان دو حکومتوں میں سے کسی نے اب تک ظاہر نہیں کیا کہ کس قدر مدد دی گئی۔ جمہوریہ سوویٹ کے دوستانہ رویہ سے ترکی ذہنیت پر بھی بہت بڑا اثر ہوا۔ ترک یہ سمجھتے رہے کہ یونان کے مقابلہ میں وہ تنہا نہیں ہے۔

باب نو

ترکی ذہنیت میں انقلابی کیفیت

انقلاب ترکی (۱۹۱۹-۱۹۲۲) کے دو نمایاں جزو تھے۔ اولاً ملکی تحفظ۔ اور دوئم سلطنت کی تنظیم۔ حیات قومی کے لئے جد و جہد کرنا مصطفےٰ کمال اور اس کی جماعت کا اولین مقصد تھا۔ لیکن اندرونی نظام میں بھی انقلاب ظہور میں آرہا تھا۔ اگرچہ اس کے اثرات مدانیہ کی عارضی صلح تک صاف طور پر عیاں نہ ہوئے تھے۔ ترکی میں جو سیاسی تغیرات ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۴ء تک وقوع میں آئے۔ ان کی اہمیت کا اصل اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب ان ترکوں کی ذہنیت کا تجزیہ کیا جائے جو ان تغیرات کے ذمہ دار تھے۔ محض صلحناموں یا معاہدوں یا واقعات کے بیان سے اس ذہنیت کا پورا

پتہ نہیں چل سکتا جس کے ماتحت انگورہ جیسے مقام پر قومی انجمن کا ۱۹۲۰ء میں آغاز ہوا اور جس کی بدولت ۱۹۲۳ء میں صلحنامہ لوزان وقوع میں آیا +

اس دوران میں رضاکاران ہر طرف سے انگورہ کی جانب رجوع ہو رہے تھے ان میں سچائی کا جوش اور جد وجہد کا ولولہ بڑھا ہوا تھا۔ اور وہ انگورہ کے تحفظ میں اپنی آیندہ آزاد زندگی کا خواب دیکھ رہے تھے + ترک قومی افسران جو برلن اور پیرس کے سفارت خانوں سے متعلق تھے برابر چلے آرہے تھے۔ اسی طرح ترک مدبرین جن کا سابقہ قسطنطنیہ میں دول یورپ کے قونصلوں سے رہتا تھا ادھر کا رخ کر رہے تھے + ایک ترکی اخبار کے مدیر بھی آن وارد ہوئے + اپنے چھاپہ خانہ کی کلوں کو علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں کسی نہ کسی طرح دول متحدہ کی بازپرس سے بچا کر آبنائے باسفورس کے پار اونٹوں پر لاد کر نکال لائے + ان کے علاوہ افغانستان اور بائیجان اور روس سے ترکی نمایندے واپس آگئے +

مسلمانان ہند میں سے بھی بعض اصحاب پنجاب سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے تاکہ ایک اسلامی آزاد حکومت کے زیر سایہ زندگی بسر کریں + مصر کے انقلاب پسند افراد اور امام احمد بن محمد بن سنوسی بذات خود اپنا صحرائی نخلستان چھوڑ کر انگورہ میں اقامت گزیں ہوئے + یہ بیرونی ممالک کے اشخاص اہل اناطولیہ کے ساتھ دوش بدوش ایک وسیع جدوجہد میں شریک ہو گئے۔ قومی انجمن نے فوراً ہی اپنے لئے ایک مختصر سا ایوان تعمیر کر لیا مدیر اخبار نے ایک اصطبل کرایہ پر لیکر اپنی کلوں کو پھر اکٹھا کیا اور وہیں سے اخبار "حکمت ملیہ" کی اشاعت شروع کر دی + ناظم فوج نے مقامی بارگوں میں ہی وفاتر جنگ کیطرح ڈال دی اور حکومت کی مختلف محکمہ جات رہائش گھروں میں قائم کر دیئے گئے + وزیر اعظم نے ریلوے اسٹیشن کے بالائی حصہ کو اپنا مسکن بنایا اور مصطفےٰ کمال بے کے لئے جو سردار کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک علیحدہ بنگلہ مخصوص کر دیا گیا اور ضروری آمدورفت کے لئے ایک موٹر کار بھی مہیا کر دی گئی + الغرض ان تکالیف

سکے باوجود اناطولیہ کے گرم جوش رضاکاروں نے قدیم ترکی
سلطنت کو بنیاد سے اکھاڑ پھینکا اور اس کی جگہ ایک نئی قومی
سلطنت کی طرح ڈال دی + اس دوران میں جس قومی تہذیب
نے ترکوں پر زیادہ تر اثر ڈالا۔ وہ فرانس کی پیش کردہ تھی +
ترکی عیسائی رعایا کی طرح خود ترک بھی فرانس ہی سے متاثر
ہو رہے تھے + سب سے قبل ۱۵۳۵ء میں فرانسس اول
اور سلیمان اعظم کے درمیان مصالحت طے پائی + بعد ازاں
۱۷۹۵ء تا ۱۸۰۱ء جب نپولین مصر پر حملہ آور ہوا۔ تو ترکوں پر
اور بھی زیادہ گہرا فرانسیسی اثر پڑا + اس زمانہ میں بحیرہ روم کے
ساحلی ممالک میں فرانسیسی تجارت کو بہت فروغ ہو چکا تھا اور
اس کے ساتھ ہی ساتھ فرانسیسی خیالات عام طور پر پھیل رہے
تھے + فرانسیسی زبان بھی کافی رواج پا چکی تھی + اس کا نتیجہ یہ
ہوا کہ ہر چند فرانس کو ۱۸۱۴ء میں سخت شکست اٹھانی پڑی
اور اس کی تجارت کا بیشتر حصہ برطانیہ عظمیٰ کے ہاتھ آیا لیکن پھر
بھی ان ساحلی ممالک سے فرانسیسی زبان اور خیالات دور نہ

ہو سکے۔ چنانچہ اناطولیہ کی اس جماعت کے سامنے ہنوز فرانسیسی
خیالات موجود تھے اور وہ انہیں خیالات پر جدید تحریک کی بنیاد
رکھ رہے تھے۔ لیکن ان خیالات کا موجودہ فرانس سے زیادہ
تعلق نہ تھا بلکہ یہ خیالات اٹھارہویں صدی کے آخیر زمانہ سے
متعلق تھے کہ جب فرانس میں خود ایک انقلاب عظیم برپا ہو رہا
تھا۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ جب ایک قوم عروج پر ہوتی ہو تو اس کے
خیالات اور اس کی اختراعات بہت جلد دیگر ممالک میں پھیل
جاتے ہیں۔ خاصکر جنگی اختراعات کی تو فوراً ہی تقلید شروع
ہو جاتی ہے۔ چنانچہ شاید ہی کوئی ایسی جنگی اختراع ہو گی کہ جو
فرانس میں سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۱۸ء مستعمل رہی ہو اور جو اناطولیہ کے
ان جنگ آزمایان کو سنہ ۱۹۲۰ء تا سنہ ۱۹۲۳ء میں نہ معلوم ہوا۔ انگورہ
کی انقلابی تحریک کے پہلے کارنامے ارض روم اور سیواس
کے اجلاس تھے جن کے بعد انگورہ میں جمہور کا ایک بڑا اجتماع
وقوع میں آیا۔ قومی معاہدہ کو پیش کیا گیا اور یک زبان ہو کر
سب نے اس کو منظور کیا۔ مجلس وطنی قائم ہوئی اور روز بروز

اس مجلس نے عاملانہ حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا شروع کیا، مدانیہ کی عارضی صلح اور لوزان کانفرنس میں حکومت انگورہ کو وہ کامیابی نصیب ہوئی کہ اس کی وقعت اور اس کا اقتدار۔ دیگر اقوام کی نظروں میں مستقل طور سے جم گیا اور باغیوں کی حکومت جائز تسلیم کر لیگئی۔

اس جماعت کے مشاہیر میں سب سے ممتاز ہستی مصطفےٰ کمال کی تھی۔ مصطفےٰ جس قدر نڈر قائد عساکر ثابت ہوا۔ اسی قدر بیدار مغز سیاست داں بھی نکلا۔ اوائل عمر میں اس کو تقریر کرنے سے دلچسپی تھی اور وہ "انقلاب فرانس" کا بڑی تجسس اور غائر نگاہوں سے مطالعہ کر چکا تھا۔ ترکی کے جدید دور کا دراصل یہی بانی ہے۔ مصطفےٰ کمال کے بعد مدبرین ترکی میں رؤف بے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ رؤف بے سابق بحری افسر تھا اور بارہا ترکی بحری لڑائیوں میں داد شجاعت دے چکا تھا۔ اس نے مصطفےٰ کمال کا ساتھ دیا اور جو مصطفےٰ کمال نے سمسون اور مشرقی حصہ میں کیا وہی سمرنا اور مغربی حصہ میں رؤف بے نے کر دکھایا۔ جنرل ملنے

نے قسطنطنیہ میں جب ۱۹۲۰ء میں قوم پسند جماعت پر حملہ کیا اور متعدد اشخاص کو گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں نظر بند کر دیا تھا تو رؤف بے بھی ان افراد میں شامل تھا۔ مالٹا سے واپسی پر انگورہ کی قومی مجلس کا پہلا نائب صدر منتخب ہوا اور جولائی ۱۹۲۲ء میں وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ اس دوران میں جب عصمت پاشا لوزان کانفرنس میں مشغول تھا۔ رؤف بے وزیر خارجہ کا بھی کام کرتا رہا۔ اگرچہ رؤف بے کو فرانسیسی زبان پر دسترس حاصل نہیں تھی لیکن وہ انگریزی بخوبی بولتا ہے۔ رؤف بے کو سیاسیات میں جنگی جذبات کی زیادتی ناپسند تھی۔ اس لئے وہ حکومت کی جانب سے مستعفی ہو کر مخالف فریق میں شامل ہو گیا۔ جب مخالف فریق کو زیادہ عروج ہوا تو ۱۹۲۴ء میں فتحی بے وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔

فتحی بے ایک زمانہ میں فوجی افسر رہ چکا تھا لیکن اس کی تدبر سیاسی اور بیدار مغزی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ وہ کچھ عرصہ پیرس کے سفارت خانہ میں بھی کام کر چکا تھا۔ مصطفےٰ کمال اور فتحی بے کا کافی زمانہ اکٹھا گذرا تھا۔ بلکہ جب صوفیہ میں فتحی بے

بحیثیت وزیر متعین تھا اس وقت مصطفی کمال اس کا ناظم تھا +
عزت پاشا کے کابینہ ۱۹۱۹ء میں فتحی بے وزیر داخلہ بھی رہ
چکا تھا + یہ بھی قسطنطنیہ میں گرفتار ہوکر مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا تھا
اور رہائی پر مصطفے کمال کے ساتھ قوم پسند جماعت کا ایک بڑا رکن
تصور کیا جاتا تھا +بحیثیت وزیر داخلہ فتحی بے ۱۹۲۲ء میں لندن
گیا تا کہ صلح کے متعلق گفت وشنید کر سکے لیکن کئی ہفتہ کی لاحاصل
کوشش کے بعد یہ انگورہ واپس آیا اور اسی کی رائے کیمطابق
ستمبر میں سمرنا پر حملہ کیا گیا جس کی وجہ سے یونانیوں کو بالآخر
شکست ہوئی + بعد ازاں ۱۹۲۴ء میں فتحی بے وزیر اعظم مقرر ہوا
لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہی پیرس میں بحیثیت ترکی وزیر روانہ کیا
گیا +جمہوریہ ترکی میں مصطفے کمال کے بعد سب سے زیادہ با اقتدار
شخصیت عصمت پاشا کی ہے + مصطفی کمال کی مانند عصمت پاشا
میں جنگی قابلیت بہت ہی نمایاں ہے اور جنگ سقاریہ کی فتح
کا سہرا اسی کے سر ہے + سیاسی معاملات میں بھی اسی کی شہرت
بہت بلند ہے +عارضی صلح مدانیہ اور لوزان کانفرنس کی کامیابی

بھی اسی کی دور اندیشی کا کرشمہ تصور کی جاتی ہیں + در اصل ترکی انقلاب میں مصطفی کمال اور عصمت پاشا کی دو ہستیاں ایسی ہیں جو اوروں کے مقابلہ میں ممتاز تر ہیں اور ان دونوں کا اثر ہر شعبہ میں نمایاں ہے + مصطفے کمال ابتدا سے ابتک صدر جمہوریت ہے۔ اور عصمت پاشا متعدد بار وزیر اعظم رہ چکا ہے + عاملانہ اور معاشرتی اصلاح بیشتر انہیں کے خیالات کیمطابق ہورہی ہے + قومی مجلس بسا اوقات ان کے ہاتھوں کٹ پتلی کی طرح کام کرتی ہے + ترکی جمہوریت کی نشو و نما کے ابتدائی زمانہ سے ہی بہت سی دیرینہ باتوں کا خاتمہ ہونا شروع ہو گیا + مراعات اور نظام ملت ہمیشہ کے لئے جاتے رہے + جمہوریت کے قیام کے لازمی معنے تھے کہ سلطانیت معدوم ہوجائے۔ لیکن مزید برآں خلافت کا بھی خاتمہ کر دیا گیا + اور اس کیساتھ ہی بہت سے اسلامی رواج مسترد کر دیئے گئے یعنی مساجد کے متعلقہ مدارس بند کر دئے گئے۔ کثرت ازدواج کو ناجائز قرار دیدیا گیا " کلاہ لالہ رنگ جو اب تک ترکی قوم سے مخصوص

تھی جلاوطن کردی گئی + انقلاب پسند جماعت ان سب باتوں
کے وجود کو اپنی قوم کے زوال سے منسوب کرتی تھی اور
اس لئے ترکی کو ان تمام خیالات کہ جن سے گذشتہ انحطاط
کو مناسبت ہو سکتی تھی پاک کر دینا چاہتی تھی + بہر حال بیرونی
دنیا کے کچھ افراد ابھی مذبذب حالت میں منتظر ہیں کہ ان سب
کا کیا انجام ہوگا + بعض کا خیال ہے کہ ترکی نے ازسرنو ایک
مستقل حکومت قائم کر لی ہے بعض کو خدشہ ہے کہ مبادا اس
انقلاب کے خلاف ایک اور انقلاب وقوع میں آئے + یہ مذہبی
شورش جو آج کل ترکی میں ہر جگہ رونما ہو رہی ہے ممکن ہے کہ
حکومت کو زیادہ تکلیف دے + آئے دن اخبارات میں درویشوں
اور شیوخ کی سزائے موت کا ذکر ہوتا ہے + ۳ر فروری ۱۹۳۱ء
کو انگورہ کی قومی مجلس نے گذشتہ شورش کے ملزموں میں سے
اٹھائیس کو سزائے موت کا حکم دیا اور اسی دن صبح کے وقت
ان سب کو پھانسی دیدی گئی + ان میں بیشتر تعداد شیوخ اور
درویشوں کی تھی + یہ سب ایک لمبا پیرہن پہنے ہوئے تھے اور

ان کے سینوں پر تختیاں آویزاں تھیں جن پر لکھا ہوا تھا" اس طرح جمہوریت اور کمال پاشا کے باغیوں کو سزا دی جاتی ہے۔" ان کے ہاتھ پشت کی جانب بندھے ہوئے تھے اور فوج کی حراست میں ان کو قصبہ مینیمن کے مختلف حصوں میں پھانسی دی گئی۔ قصبہ کے باشندے موجود نہ تھے کیونکہ بموجب حکم وہ صبح کے آٹھ بجے سے قبل باہر نہیں نکل سکتے تھے۔

باب دس

مراعات اور نظامِ ملت کا خاتمہ

ترکی کی آزمائش بالآخر ختم ہوئی اور جنگ کی خونریزیوں سے وہ سُرخ روئی کے ساتھ عہدہ برا ہوئی + اپنی آزادی قائم رکھنے کے لیے ترکی کوشاں تھی کہ بیرونی ممالک کی جابرانہ قیود سے نجات حاصل کرے +

مگر ترکی کی اس خواہش کی تکمیل میں چند وجوہ سدِّ راہ تھے۔ اور ضروری تھا کہ اول ان کا ازالہ کیا جائے + غیر اقوام کو ترکی مملکت میں خاص مراعات حاصل تھے اس کے باعث ترکوں کو سلطنت کے اندرونی نظم و نسق میں ایک بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا + علاوہ ازیں نظامِ ملت نے حالات کو اور بھی پیچیدہ بنا رکھا تھا + قسطنطنیہ میں سلطان کی موجودگی

سے حکومت انگورہ کو ہمیشہ خدشہ رہتا تھا مجلس وطنی کا خیال تھا کہ متذکرہ بالا امور ملکی بہبودی کے منافی ہیں اور اس لئے جلد از جلد ان جملہ خصوصیات کو جو گذشتہ صدیوں میں ترکی طرز حکومت کا جزو بن چکی تھیں وہ نیست و نابود کر دینا چاہتی تھی۔

ترک سب سے پہلے مراعات کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ مراعات گذشتہ صدیوں میں سلاطین عثمانیہ نے غیر ترک باشندگان کو عطا کئے تھے۔ جن کے باعث غیر اقوام اور ان کے بعض افراد کو خاص حقوق حاصل تھے۔ یہ حقوق بسا اوقات عدالتی۔ اقتصادی، اور تجارتی نوعیت رکھتے تھے۔ عدالتی مراعات کے ماتحت بعض غیر ترک اقوام کو حق حاصل تھا کہ وہ ترکی میں اقامت گزیں ہونے پر بھی اپنے ہم قوم حکام کے روبرو مرافعہ کریں اور اپنے وطنی قوانین کے مطابق فیصلہ کرالیں بشرطیکہ فریقین مقدمہ ایک ہی قوم کے ہوں۔ بیرونی سفیروں کو ۱۸۳۵ء سے اپنے ہم قوم افراد پر دیوانی معاملات میں مکمل اختیارات دیدیئے گئے تھے حتی کہ غیر ملکی افراد یا وجود

خواہش کے بھی عثمانی عدالتوں میں اپنے معاملات پیش نہ کر سکتے تھے۔ جب فریقین دو مختلف غیر ممالک کے افراد ہوتے تھے تو مقدمات کی سماعت ایسے حاکم کے سامنے ہوتی تھی جو مدعا علیہ کا ہم وطن ہوتا تھا۔ جب فریقین میں سے ایک عثمانی رعیت ہوتا تھا تو مقدمات ہمیشہ عثمانی عدالت کے روبرو پیش کئے جاتے تھے لیکن ایسی صورت میں بھی غیر ملکی سفیر کو فیصلہ منظور یا مسترد کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ غرضیکہ غیر ملکی افراد کو عدالتی کارروائیوں کے لئے وہی حقوق جو انہیں اپنے ملک میں میسر تھے حدود ترکی میں بھی حاصل تھے۔

تجارتی مراعات کی وجہ سے ترکوں کو یقیناً بڑی دشواری کا سامنا ہوتا تھا۔ بیرونی تاجر جہاں چاہتے تھے اپنا کاروبار پھیلا دیتے تھے۔ قانون ان کی گرفت سے عاری تھی۔ چنانچہ قسطنطنیہ اور دیگر مقامات پر بیرونی تاجر اپنا کاروبار بغیر کسی قانونی روک ٹوک کے چلا رہے تھے کئی غیر ملکی بنک بھی کھلے ہوئے تھے۔ مزید برآں بیرونی ممالک

نے کئی جگہ اپنے ڈاک خانہ جات قائم کر رکھے تھے جو بظاہر
تو خط وکتابت کی آسانی اور حفاظت کے لیئے تصور کیئے جاتے
تھے لیکن دراصل ترکوں کے خیال کے مطابق ممنوع اشیار
کی آمد و رفت اور مخالفانہ تحریک پھیلانے کا ایک مسلسل اور مستقل
ذریعہ تھے +

یہ مراعات جو ترکوں کے لیئے ایک اہم مسئلہ بن گئے
تھے + دراصل اولاً سلاطین نے اپنی خوشی سے غیر ملکی افراد
کو عطا کیئے تھے + لیکن ان مراعات سے غیر ممالک بہت جلد
ناجائز فائدہ اٹھانے لگے اور اس لیئے یہ ترکی کے لیئے ناقابل
برداشت ہوتے گئے + بیرونی قونصلوں کے اختیارات بہت
وسیع تھے مقامی پولس اور دیگر ترکی حکام کو بسا اوقات بڑی
دقت کا سامنا ہوتا تھا + غیر ملکی افراد کی نظروں میں ترکی پولس
کا عدم وجود یکساں تھا + اس لیئے وہ مراعات کی آڑ میں ہمیشہ
ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیئے کوشاں رہتے تھے + اقتصادی
اعتبار سے مراعات ترکوں کے لیئے اور بھی پریشان کن تھیں +

غیر ملکی افراد پر بجز ایک نہایت حقیر ٹیکس کے جو درآمد برآمد پر بحساب فی شے مقرر تھا کسی قسم کا کوئی محصول نہ لگایا جا سکتا تھا نیز ان غیر ملکی افراد سے کوئی مقامی ٹیکس بھی نہ لیا جاتا تھا۔ درانحالیکہ وہ ان تمام آسائشوں سے جو حکومت کی جانب سے مہیا کی جاتی تھیں بہرہ اندوز ہوتے تھے + ان حالات کے ماتحت ترکی میں ایک وسیع اور تباہ کن تجارت فروغ پا رہی تھی جس کی وجہ سے ملکی صنعت و حرفت کا خاتمہ ہوا جا رہا تھا + ان اسباب کی بنا پر ترکی مالیہ کی حالت حد درجہ نازک ہو رہی تھی + ملکی کارخانہ جات ابتر ہو رہے تھے صنعت و حرفت بھی روز بروز رو بہ تنزل تھیں + برخلاف اس کے غیر ملکی تجارت کو ہر طرح ترکی میں فروغ تھا اور بیرونی ساہوکاروں کا اثر حکومت پر دن بدن زیادہ ہوتا جا رہا تھا + دراصل مراعات کے پردہ میں غیر ممالک اس قدر ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے کہ ان کا برقرار رکھنا ایک آزاد ملک کے لئے نا قابل برداشت ہو چکا تھا + غیر ممالک خود اس بات کے مقر تھے

اور ان مراعات کی تنسیخ کے لئے کم وبیش رضامند تھے لیکن اس کے لئے بھی معاوضہ کے خواہاں تھے۔

جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی حکومت عثمانیہ نے سب سے پہلے مراعات کا خاتمہ ستمبر ۱۹۱۴ء میں کیا۔ ترکی اسوقت تک جنگ میں شامل نہ ہوئی تھی۔ دول متحدہ کی جانب سے ترکی کے اس رویہ پر اعتراض کیا گیا۔ بعدازاں جنگ کے خاتمہ پر جب دول متحدہ نے پھر اپنے مراعاتی حقوق سنبھالے تو قومی جماعت نے ایک کرخت صدائے احتجاج بلند کی اور اپنے قومی معاہدہ (دفعہ چھ) کی رو سے ۱۹۲۰ء میں صاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ ترک ان مراعات کو ہرگز برقرار نہ رہنے دینگے اسی شرط کی وجہ سے قومی جماعت نے صلحنامہ سیورے ۱۰؍ اگست ۱۹۲۰ء کو یک قلم نامنظور کر دیا تھا۔ دول متحدہ کی کوشش تھی کہ پُرانے مراعات برقرار رکھے جائیں لیکن مصطفیٰ کمال اور اس کے ہمخیال ایک ثانیہ کے لئے اسپر بحث کرنا فضول سمجھتے تھے انہوں نے یک زبان ہوکر اعلان کر دیا کہ وہ اپنی آزادی

کے شفاف آئینہ کو ایسی قیود سے کبھی مکدر نہ ہونے دیں گے۔
چنانچہ ۲۲-۱۹۲۱ء میں جب لوزان کانفرنس کا پہلا جلسہ منعقد ہوا
تو عصمت پاشا نے قومی مجلس کی ہدایات اور خواہشات کے
مطابق تنسیخ مراعات کو اہم ترین شرط قرار دیکر مطالبہ کیا کہ جب
تک اس مسئلہ کا فیصلہ نہ ہو جائے گا ترک کسی طرح صلح کرنے کے
لیئے امادہ نہ ہوں گے۔ خواہ اس جد و جہد میں ان کو ازسر
نو جنگ آزمائی کرنا پڑے۔ دوسری جانب سے لارڈ کرزن
برطانی نمایندہ اور دیگر دول متحدہ کے مشیر کار اسی قدر سختی
کے ساتھ مراعات حاصل کرنے پر اڑے رہے۔ دونوں جانب
سے اس مسئلہ کو اس قدر وقیع تصور کیا جاتا تھا کہ بالآخر گفت
و شنید منقطع ہو گئی اور لارڈ کرزن لندن واپس چلا گیا۔ عصمت
پاشا بھی اپنی ناکامی کے باعث افسردہ خاطر اپنے وطن کو واپس
پہنچا۔ انگورہ پہنچنے پر مصطفےٰ کمال اور مجلس وطنی نے عصمت پاشا
کی اس قدر حوصلہ افزائی کی کہ دوبارہ جب وہ لوزان کانفرنس
میں شریک ہوا تو پیشتر سے کبھی زیادہ سختی کے ساتھ اپنے مطالبات

پرا اڑا رہا + لارڈ کرزن کی جگہ سر ہوریس رمبولڈ - برطانی نمائندہ مقرر کیا گیا انجام کار تنسیخ مراعات کے لئے دول متحدہ کو رضا مندی دینی پڑی + یہ فیصلہ صریحاً ترکی کے موافق ہوا - دول متحدہ کو اس مسئلہ میں زک اٹھانی پڑی اور اس طرح مراعات کا نہایت دیرینہ نظام یک قلم منسوخ ہو گیا + جاپان کی طرح ترکی کے لئے بھی یہ فیصلہ مکمل آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوا + اگر انصاف سے غور کیا جائے تو ترکی یقیناً اپنے اس مطالبہ میں حق بجانب تھی +

لازمی امر ہے کہ ایک ملک کی آزادی قائم رکھنے کے لئے اس کو اس قسم کی قیود سے آزاد ہونا چاہیئے + لیکن چونکہ یہ فیصلہ کسی قدر دفعتاً اور خلاف توقع - وقوع میں آیا تھا - اس لئے غیر ممالک کو ناگوار گذرا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ترکی تجارت و کاروبار کو بھی عارضی نقصان برداشت کرنا پڑا +

سلطنت عثمانیہ میں مدت سے ایک کثیر تعداد غیر مسلم جماعت کی چلی آتی تھی + اناطولیہ کے مغربی حصہ میں یونانی باشندے

ترکوں کے ورود سے بھی دو ہزار سال قبل سے آباد تھے۔ بازنطینی عیسائی بھی قدیم باشندے تھے جو بوجوہ چند ترکی رعایا میں شامل ہو گئے تھے + یہ انسانی گلہ یعنی رعایا مختلف "ملتوں" میں تنظیم پا چکا تھا + اور ہر چند "ملت" کو اپنے افراد پر کمال اقتدار حاصل تھا لیکن وہ سب سلطان کے تابع تھے + انگورہ کی مجلس وطنی نے تنسیخ مراعات کے بعد ان با اقتدار ملتوں کی جانب توجہ مبذول کی + ان غیر جماعتوں کی تنظیم دراصل سلطان محمد دوئم فاتح قسطنطنیہ نے ۱۴۵۳ء میں کی تھی + فتح قسطنطنیہ کے بعد سلطان محمد نے غیر مسلم جماعتوں کو ان کے عقائد اور مذاہب کے مطابق مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا + ان میں سے ہر ایک گروہ اپنی مذہبی پیشوا کے تابع تھا + یہ مذہبی پیشوا۔ علاوہ مذہبی فرائض ادا کرنے کے اپنے گروہ میں عدالتی احکام بھی جاری کرتے تھے + یہی گروہ "ملت" کے نام سے موسوم ہو جاتا تھا اور اس کا مذہبی پیشوا "ملت باشی" کہلاتا تھا جس کو اختیارات باقاعدہ طور پر باب عالی سے عطا کئے جاتے تھے + چنانچہ اس

طرح ایک "ملت کو مجموعی حیثیت سے منجانب سلطان خاص
حقوق حاصل ہو جاتے تھے۔ ایک ملت کے افراد کا تعلق حکومت
سے براہ راست نہ ہوتا تھا بلکہ جس طرح ملکی رعایا اپنے سفیر
کے توسل سے اپنی ضروریات کا اظہار کرتی ہے اسی طرح
وہ اپنے سردار کے ذریعہ سے جملہ کارروائی کرتے تھے۔
مزید برآں ہر ایک ملت میں اگرچہ بیشتر افراد ترکی رعایا
ہوتے تھے۔ لیکن وہ ترکی قوانین کے پابند نہ تھے۔ حکومت
کو ان ملتوں کے انتظام سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس لئے
ابتدا میں اس نظام سے یقیناً عثمانیہ حکومت کو بہت مدد ملی۔
جب تک یہ ملتیں وفادار رہیں اس وقت تک حکومت
کو اس نظام سے کوئی خدشہ پیدا نہ ہوا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ
اس کا ضرر رساں اثر نمایاں ہونے لگا۔ ترکی تمدن اور
معاشرت ان ملتوں کی عصبیت پر زیادہ اثر نہ کر سکا۔ بلکہ ان
ملتوں کے باعث ترکی میں فرقہ وارانہ احساس پیدا ہوتے گئے
جن کی وجہ سے افراد ملت میں آزادی کی خواہش موجزن

ہونے لگی + چنانچہ ترکی میں غیر قومی جذبہ روز بروز مستحکم ہوتا گیا۔ یہ ملتیں بیرونی ممالک سے ترکی کے خلاف خفیہ معاہدے بھی کرنے لگیں + ان حرکات کے علاوہ ان ملتوں میں آپس کے نفاق کے باعث برابر چھیڑ چھاڑ چلی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے حکومت کو اور بھی پریشانی اٹھانی پڑتی تھی + یہ ملتیں اگر کبھی متفقہ طور پر عمل پیرا ہوتی تھیں تو محض حکومت کی خلاف۔ ورنہ ایک دوسرے سے نہایت درجہ عداوت رکھتی تھیں جس کے باعث ملک میں ہلچل اور بدامنی پھیلی رہتی تھی + یونان اور بلغاریہ کی عیسائی ملتوں میں آئے دن قتل و خون کا بازار گرم رہتا تھا + یوروشلم میں مختلف عیسائی فرقے مقامات مقدسہ کے متعلق متواتر شورش کرتے رہتے تھے + ان جھگڑوں کی بنا۔ بسا اوقات "ملت باشی" خود ہوتے تھے۔ جو ایک دوسرے کی خلاف سازشوں میں مشغول رہتے تھے یا حکومت کو کمزور کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔ بہرحال وہ اپنے حقوق سے بے اندازہ ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے +

انہیں وجوہات کے بنا پر نظام ملت ترکوں کے لئے
ناقابل برداشت ہوگیا تھا۔ بالخصوص قوم پسند جماعت تو بالکل
متنفر ہو چکی تھی چونکہ ان کا مدعا ایک قومیت کو مستحکم بنانا اور
امن قائم کرنا تھا۔ درحقیقت نوجوان ترکوں کی تحریک سے
قبل بھی نظام ملت کے خلاف اظہار خیال کیا جاتا تھا اور
رفتہ رفتہ یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک قومیت قائم کرنے
کے معنے تھے کہ اقلیتوں کے ساتھ خصوصی برتاؤ نہ کیا جائے
اور ان کے تمام امتیازی حقوق کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ان
خیالات کا اعادہ نہایت زور کے ساتھ لوزان کانفرنس
میں کیا گیا۔ ترکی علاقہ جات کم ہو جانے کے باعث بہت سی
ملتوں کا سوال بھی جاتا رہا تھا۔ تاہم یونانی اب بھی کافی تعداد
میں تھریس اور قسطنطنیہ میں موجود تھے۔ لوزان کانفرنس میں
اس مسئلہ کو حل کرنے کے وہ ترکیب اختیار کی گئی جس کی کامیابی
کے متعلق تمام یورپ اور امریکہ کو شبہہ تھا۔ ترکی اور یونانی
دونوں حکومتوں نے اس پر فیصلہ کیا کہ ترکی عیسائی رعایا یونان

میں چلی جائے اور اسی طرح یونانی مسلم افراد ترکی میں ہجرت کر جائیں تاکہ آئندہ کے لئے باہمی پرخاش کا اندیشہ نہ رہے۔ ہر چند اس تبادلہ سے لاکھوں بے گناہ خانماں ہو گئے اور ہر طرف سے صدائے احتجاج بھی بلند کی گئی۔ لیکن اس کا خوشگوار نتیجہ اب صاف عیاں ہے۔ املاک اور حقیت کا تخمینہ دونوں علاقہ جات میں کیا گیا اور جہاں تک ممکن ہوا مساوی قیمت کی حقیت تبادلہ میں افراد کو دی گئی۔ بالآخر ترکی میں ایک قومیت قائم ہو گئی۔ اگرچہ ہنگری کے مانند ترکی کی عظیم الشان سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے لیکن انجام کار ایک متفقہ قومیت ضرور قائم ہو گئی جس کے افراد بخیال دہم مذہب ہونے کے علاوہ اپنے قیام اور بہبودی کے لئے جان تک قربان کر دینے کو آمادہ تھے۔

باب گیارہ

نہ دارا ماند نہ آن دوری

ان واقعات کی رو میں سلطانیت کا خاتمہ لابدی امر تھا اور اس لیے سلطان کی جانب سے بھی کوئی مدافعانہ کوشش نہیں کی گئی۔ سلطان وحید الدین اس خاندان کا آخری فرمانروا تھا جو چھ سو سال تک متواتر ترکی میں حکمراں رہا اور جس کی طویل مدت حکومت کی مثال تاریخ اسلام ہی میں کیا تاریخ عالم میں بھی بمشکل مل سکے گی۔ ہر چند کہ یہ واقعہ دفعتاً پیش آیا لیکن دراصل باب عالی کا اقتدار گذشتہ کئی ماہ سے برابر زائل ہو رہا تھا اور سلطان "ظل اللہ" کی حکومت برائے نام رہ گئی تھی۔ سلطان دول متحدہ کے ہاتھوں میں کٹ پتلی کی طرح ناچ رہا تھا اور قوم کو سنبھالنے کی طاقت و استطاعت نہ رکھتا تھا۔ لیکن دول متحدہ

یہ جانتے ہوئے کہ سلطان کا اقتدار ختم ہو چکا ہے متواتر باب عالی سے گفت و شنید کرتی رہیں۔ حتیٰ کہ لوزان کانفرنس کے لئے بھی باب عالی سے نمایندے طلب کئے گئے + حکومت انگورہ کی جانب سے اس کی مخالفت کی گئی۔ مصطفیٰ کمال نے صاف طور پر فرانسیسی وزیر خارجہ کو لکھ دیا کہ حکومت قسطنطنیہ پر قوم کا اعتماد نہیں اس لئے اس حکومت کو قوم کی نمایندگی کا بھی کوئی استحقاق نہیں + اس اظہار خیال سے نہ صرف حکومت قسطنطنیہ کو غاصب قرار دیا گیا بلکہ سلطان وحیدالدین کو جائز حکمراں تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا گیا +

کچھ دنوں کے بعد سلطان اور اس کے وزراء کے خلاف انگورہ کی حکومت نے غداری کا الزام لگایا اور ان پر مقدمہ چلانے کا حکم صادر کیا + سلطان نے یہ سننے کے بعد عدالت میں حاضر ہونے اور تخت سے معزول کئے جانے سے انکار کر دیا۔ لیکن اپنی زندگی معرض خطر میں پا کر برطانی جنرل سر چارلس ہیرنگٹن سے معاونت چاہی + لندن سے احکام آنے پر سلطان

وحیدالدین کے لیئے ایک برطانی جنگی جہاز پر انتظام کر دیا گیا۔
۱۷ رنومبر ۱۹۲۲ء کو علی الصباح سلطان معہ اپنے دس سالہ فرزند
شہزادہ ارطغرل آفندی اور چھ دیگر رفقاء کے محل کے ایک
چور دروازہ سے برآمد ہوئے۔ اور بغیر کسی کو اطلاع ہوئے
موٹر میں سوار ہو کر برطانی جہاز "ملایا" پر جا پہنچے۔ اس جہاز نے
سلطان اور ان کے رفقاء کو جزیرہ مالٹا میں کہ جو برطانی مقبوضہ ہے
پہنچا دیا۔ سلطان نے جہاز پر پہنچکر اعلان کیا کہ قسطنطنیہ سے روانگی
کا مدعا تخت عثمانیہ سے دست برداری نہیں بلکہ مقصد صرف یہ ہے
کہ پُرخطر حالات سے مامون رہنے کے لیئے عارضی طور پر مالٹا
میں قیام کریں۔ قوم پسند جماعت نے سلطان کی فراری سے
فائدہ اٹھایا اور یہ اعلان کر دیا کہ عیسائی محافظت قبول کرنے اور
نیز ترکی سے چلے جانے کو سلطان وحیدالدین کا تخت سے دست
بردار ہونا تصور کیا جائے۔ اس واقعہ کے بعد قوم پسند جماعت
نے بادشاہت کے بجائے جمہوریت کی بنیاد ڈالنی شروع
کر دی۔

خلیفۃ المسلمین سلطان وحید الدین کے قسطنطنیہ سے فرار ہونے کے بعد مجلس وطنی انگورہ نے ۱۸ر نومبر ۱۹۲۲ء کو عبدالمجید آفندی کو جو سلطان عبدالعزیز کے خلف دوم تھے بحیثیت خلیفہ منتخب کیا لیکن ان کو منصب بادشاہی سپرد نہیں کیا گیا۔ اس موقع پر جو مجلس منعقد ہوئی اس میں خطبہ بجائے عربی کے ترکی زبان میں پڑھا گیا جس سے ترکی قومیت کا اظہار کرنا مقصود تھا۔ خلیفہ عبدالمجید آفندی کو "امیر المومنین" کے خطاب سے بھی سرفراز کیا گیا لیکن ان کو کسی قسم کا ملکی اقتدار نہیں دیا گیا۔

غالبًا قومی تحریک کے ابتدائی زمانہ میں قوم پسند جماعت کا یہ مدعا نہ تھا کہ طرز حکومت کو بدل ڈالیں۔ سلطان کو مجبور اور بیچارہ پاکر وہ بدنیت ممالک سے برسرپیکار تھی کہ ترکوں کی رہی سہی آزادی بھی سلب نہ ہو جائے۔ اس جماعت کو حکومت قسطنطنیہ کا دول متحدہ کے اشاروں پر چلنا نہایت شاق گذرتا تھا۔ وہ کو شاں تھی کہ سلطان کی شخصیت کو از سر نو

آزاد اور خود مختار بنا دیا جائے۔ لیکن اس سے بھی پہلے ملک کو بیرونی تصرفات سے پاک کرنا لازمی تھا۔ چنانچہ بمقام سیواس جو قومی کانگریس ۹ ستمبر ۱۹۱۹ء کو منعقد ہوئی تھی اس میں اعلان کر دیا گیا تھا کہ قوم پسند جماعت کا مدعا سلطانیت اور خلافت کا تحفظ اور ملک کو غیر اقوام کی چیرہ دستیوں سے آزاد کرنا ہے۔ بعد ازاں ۲۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو جو قومی معاہدہ عثمانیہ پارلیمنٹ بمقام قسطنطنیہ میں قرار پایا تھا اس سے بھی کسی طرح ظاہر نہ ہوتا تھا کہ طرز حکومت میں تبدیلی کی جائے گی۔ بہر حال دو سال گذرے تھے کہ سلطان کو معزول کر دیا گیا اور ایک نئی طرز کی حکومت قائم کر دی گئی۔ شروع میں انقلابی فرقہ نے مختار مطلق کی مانند عنان حکومت سنبھالی۔ لیکن گیارہ ماہ کے بعد جمہوریت کا اعلان کیا گیا اور اس طرح خاندانی بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ فعل مصطفےٰ کمال یا اس کی جماعت کی خود غرضی پر مبنی نہ تھا بلکہ حکومت قسطنطنیہ اور خود سلطان۔ دول متحدہ

سے اسقدر موثر ہو چکے تھے کہ ان کے احکامات سراسر قوم کے اعدا کے موافق ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں سلطان بحیثیت خلیفۃ المسلمین مسلمانان عالم سے بھی تعلق رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن ترکی بحیثیت ایک آزاد قوم۔ بین الاقوامی اسلامی معاملات میں پڑنے سے احتراز کرنا چاہتی تھی۔ سلطانیت کے برقرار رہنے سے قدامت پسند جماعت کے پھر غلبہ پا جانے کا امکان تھا۔ ایسی حالت میں قدامت پسند۔ مغربی خیالات و تمدن کی بڑھتی ہوئی رو کے لیئے سد راہ ہوتے۔ انقلاب پسند جماعت کو مطلقاً یہ گوارہ نہ تھا۔ ان وجوہ کے باعث انقلاب پسند جماعت کے نزدیک طرز حکومت میں تبدیلی ناگزیر تھی۔

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ خاندان عثمانیہ میں شخصی حکومت قائم تھی رعایا کو شاہی ملکیت تصور کیا جاتا تھا۔ آمدنی کے جملہ ذرائع سلطان کی ذات کے لیئے وقف تھے۔ سلطان مجاز مطلق تھا کہ رعایا اور ملک کی بہبودی کے لیئے جس قدر مناسب سمجھے صرف کرے سلطانی منشا سے کوئی شخص تعرض نہ کر سکتا

تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ شخصی حکومت خلافت راشدہ کے اصولوں پر مبنی نہ تھی۔ بلکہ اس کا انحصار وراثت نسلاً بعد نسلاً اور استبداد شخصی پر تھا۔ اس لئے جب جمہوریت کا اعلان کیا گیا تو عوام نے اس کو آزادی کا پیغام سمجھ کر خوش آمدید کہا۔ سلطانیت کے خاتمہ کے ساتھ بیجا سلطانی اخراجات کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ محلات شاہی کے بے شمار ملازمین اور متعلقین بر طرف ہو گئے۔ اور اس طرح ترکی مالیہ کو ایک کثیر رقم بچ گئی۔

حکومت انگورہ نے استنبول کے دفاتر جنہیں ضرورت سے زیادہ اہلکار بھرے ہوئے تھے بند کر دیئے اون کے بجائے انگورہ میں متوسط پیمانہ پر نئے دفاتر قائم کر دیئے گئے۔ علاوہ ازیں قوم پسند جماعت کو سلطان وحید الدین آفندی کے طرز عمل پر جو اس نے ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۳ء تک اختیار کیا تھا سخت اعتراض تھا۔ ان کے نزدیک سلطان نے اپنے ذاتی مفاد یعنی اپنی بادشاہت قائم رکھنے کے لئے دول متحدہ

کو اپنا سرپرست بنا رکھا تھا اور قوم اور ملک کو بالکل چھوڑ دیا تھا + چنانچہ جمہوریت قائم کرنے سے ان کا مدعا یہ بھی تھا کہ آیندہ کے لئے قومی مفاد کسی واحد شخص کے ذاتی اغراض کی بنا ر پر قربان نہ کر دیئے جائیں + ۲ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو بیرونی افواج نے قسطنطنیہ بالکل خالی کر دیا اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو جمہوریت کا اعلان کر دیا گیا +

صدر جمہوریت کے انتخاب کے لئے بڑے شوق کے ساتھ تیاری کی گئی + غازی مصطفیٰ کمال پاشا کو متفقہ طور پر صدر منتخب کیا گیا۔ اور ہر طرف سے زندہ باد "جمہوریت" کے نعرے بلند کئے گئے + ترکی میں جہاں ہمیشہ سے شخصی حکومت قائم تھی یہ نعرے پہلی مرتبہ سنے گئے تھے۔ لیکن جمہوریت کو بہت جلد ایک عام مقبولیت حاصل ہو گئی + ہر جگہ اس انتخاب پر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ ایک سو ایک توپ کی سلامی جو سلاطین کے لئے مخصوص تھی دی گئی + کچھ عرصہ بعد مصطفیٰ کمال قسطنطنیہ گیا۔ وہاں اس کا نہایت پر جوش خیر مقدم کیا گیا + مصطفیٰ کمال کی

شخصیت جمہوریت میں نہایت وقیع ہے اور آج جبکہ جمہوریت کو قائم ہوئے آٹھ سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس کی قدر و منزلت اور بھی افزوں ہے+

یہ دیکھکر کہ موجودہ طرز حکومت کا انحصار بھی زیادہ تر ایک واحد شخص پر ہے۔ کچھ افراد ایسے ہیں جو اس کے مستقبل کے متعلق کوئی با وثوق رائے زنی کرنا غلطی سمجھتے ہیں + انکے دلوں میں نوجوان ترکوں کی تحریک کی یاد از سر نو تازہ ہو جاتی ہے + نوجوان ترکوں کی ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء کی کامیابی یورپ میں ہر جگہ بڑی خوشی کے ساتھ دیکھی گئی تھی۔ لیکن سلطان عبدالحمید نے آخرکار دوبارہ اپنا اقتدار جما لیا تھا۔ اور نوجوان ترک منتشر ہو گئے تھے + یہ وہی تحریک اب پھر نئی شکل میں نمودار ہو کر کامیاب ہو چکی ہتی۔ لیکن عام طور پر اس کے مستقبل کے متعلق عوام متفق الخیال نہ تھے + انقلابی تحریک اکثر مدتوں میں کامیاب ہوتی ہے۔ فرانس میں پے درپے انقلاب ۱۷۸۹ء سے ۱۸۷۱ء تک وقوع میں آتے رہے اور اتنے عرصہ کی خانہ جنگی کے بعد

جمہوریت کا مستقل قیام ممکن ہو سکا۔

ترکی جمہوریت کے متعلق ایک اور امر غور طلب ہے۔ امریکہ یا فرانس میں انقلابی کیفیت علاوہ دیگر اقتصادی یا ملی وجوہ کے علمی خیالات کے باعث وقوع میں آئی تھی۔ عوام کو آزادی اور مساوات کا احساس علمی تصانیف سے ہوا تھا۔ والیٹر اور روسو کی تصانیف نے تمام فرانس میں ایک ہلچل ڈال دی تھی۔ لیکن ترکی میں یہ خیالات عام نہیں تھے۔ کمیٹی اتحاد و ترقی یا نوجوان ترکوں کا حلقہ محدود تھا۔ قوم پسند جماعت مقابلتاً زیادہ وسیع تھی۔ لیکن اس کے عام افراد کا مطمح نظر جیسا کہ ابھی لکھا جا چکا ہے ملک کو غیر اقوام کے بیجا تصرف سے محفوظ رکھنا تھا نہ کہ جمہوریت کا قائم کرنا۔ اب یہ عیاں ہو گیا ہو گا کہ ترکی جمہوریت کا آغاز ایک ایسے انقلاب کے بعد ہوا کہ در اصل جس سے مقصد جمہوریت قائم کرنا نہ تھا۔ اس لئے جب تک عوام الناس کی ذہنیت جمہوریت کے موافق نہ ہو جائے گی اس وقت تک اس نئی طرز حکومت کے مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ ایک اسلامی سلطنت

کی بنیاد حقیقتاً جمہوریت پر ہی ہونی چاہئے۔ لیکن ترکی جس میں
چھ سو سال سے زائد شخصی حکومت کا دور دورہ رہ چکا ہے۔
اور جس میں انقلاب۔ مغربی تقلید کے باعث ہوا ہے+ کہاں
تک اور کس قدر جلد جمہوریت سے آشنا ہو سکے گی۔ ابھی وثوق
کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا+ یہ امر مسلمہ ہے کہ ارتقائی نشوونما
بمقابلہ انقلابی اثرات کے زیادہ یقینی اور دیرپا ہوتا ہے +
انقلاب کا لازمی اثر ہے کہ قدامت پسند جماعت کو نئے اصولوں
سے خواہ کیسے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔ ایک گونہ تنفر پیدا ہو جاتا
ہے۔ اور انقلاب کے دوران میں یا اس کے فوراً ہی بعد
مخالف تحریکات شروع ہو جاتی ہیں + انقلاب اسی صورت
میں کامیاب ہو سکتا ہے کہ جب عام طبقہ کی ذہنیت اس کے
موافق ہو اور اس کے لئے علمی ذرائع اور وقت درکار ہوتے
ہیں + انگلستان اور فرانس کی دو مثالیں پیش نظر ہیں + انگلستان
کی موجودہ طرز حکومت ارتقائی نشوونما کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ فرانس
کو کئی خونی مراحل طے کرنے کے بعد یہ حالت نصیب ہوئی ہے +

اگر انقلاب کی رفتار اعتدال پر ہو اور اس دوران میں عوام الناس کے خیالات بھی ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے چلے جائیں تو کامیابی کی امید زیادہ ہو سکتی ہے لیکن اگر انقلاب اس قدر سُرعت کے ساتھ وقوع میں آئے کہ عام طبقہ کے خیالات بہت جلد پیچھے رہجائیں۔ تو اس کی بنیاد فوراً متنزلزل ہو سکتی ہے + یہ سب دشواریاں ابھی تک ترکی کے متعلق رائے زنی کرتے ہوئے سامنے آتی ہیں۔ لیکن ممکن ہے کچھ اور عرصہ کے بعد فضا بالکل صاف ہو جائے۔ اور یہ دشواریاں بھی رفع ہو جائیں +

باب بارہ

خاتمہ خلافت

۳ر مارچ ۱۹۲۴ء

سلطان وحید الدین کے فرار ہونے اور معزولی پر عبد المجید آفندی کو "مجلس وطنی" نے خلیفہ مقرر کیا + عبد المجید سے سلطان وحید الدین اپنے گذشتہ چار سال کی حکومت میں خوش نہ تھے چونکہ عبد المجید کھلم کھلا۔ انگورہ جماعت کی طرفداری کرتے تھے + جب وحید الدین ملک سے فرار ہو گئے اور ان کے ساتھ بادشاہت بھی ختم ہو گئی۔ تو "مجلس وطنی" نے عبد المجید کو بحیثیت خلیفہ مقرر کیا + یہ ایک بالکل نئی بات تھی چونکہ اوّلاً تو خلیفہ کا تقرر کیا گیا + اور دوسرے "خلافت" سے "بادشاہت"

جدا کر دی گئی تھی، لیکن یہ خلافت بھی دیرپا ثابت نہ ہوئی اور سولہ ماہ کے مزید تجربے کے مجلس وطنی نے اپنی خود ساختہ خلافت کا بھی ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو خاتمہ کر دیا۔

خلیفہ عبد المجید آفندی کو بھی اپنے چچا سلطان وحید الدین کی مانند جلا وطنی اختیار کرنی پڑی۔ عبد المجید آفندی کے خلاف کسی قسم کا کوئی الزام نہیں لگایا گیا۔ دراصل خلافت کے خاتمہ کو عبد المجید کی ذاتی حیثیت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ ایک اصولی نقطہ نظر سے مجلس وطنی خلافت کو قائم رکھنے کے لیے تیار نہ تھی۔ خلافت کے اقتدار کو ترک خواہ کسی قدر کم کیوں نہ کر دیتے۔ لیکن خلیفہ تاہم بھی "خلیفۃ المسلمین" ہوتا اور تمام عالم کے مسلمانوں کو جو اس سے تعلق ہوتا وہ مجلس وطنی کے کسی قانونی گرفت میں نہیں آ سکتا تھا۔ اس لیے مجلس وطنی کے لیے دو ہی باتیں تھیں یا وہ خلافت قائم رکھتی اور اس کے ساتھ جملہ اسلامی خصوصیات بھی برقرار رکھتی یا خلافت کو ایک سرے سے ہی اڑا دیتی۔ مجلس وطنی نے خلافت کو ختم کر دینا ہی اپنے

لئے بہتر سمجھا +

خلافت کا منصب اسلامی دنیا میں دیرینہ تھا اس کے ساتھ سیاسی اقتدار بھی ہمیشہ توام رہا ہے + چنانچہ گذشتہ رواج اور خیالات کی بنا پر مسلمانان عالم کے لئے یہ مشکل امر تھا کہ وہ دفعتاً خلیفہ کو محض مذہبی پیشوا کی حیثیت سے تصور کر سکتے + چنانچہ مجلس وطنی کو یہ خدشہ پیدا ہو رہا تھا کہ مبادا کوئی انقلاب رونما ہو اور خلیفہ کو سیاسی اقتدار از سر نو حاصل ہو جائے + قرون وسطیٰ کی عیسائی سلطنتوں میں اکثر اسی طرح خانہ جنگیاں چھڑ چکی ہیں حالانکہ پوپ کی محض مذہبی پیشوا کی حیثیت ہوتی تھی اور یورپ میں جلد ہی مذہب کا سیاست سے تعلق منقطع ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی دوسرے عیسائی ممالک پر اس کا اس قدر اثر ہوتا تھا کہ ہر ایک بادشاہ پوپ کی نظر عنایت اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے کوشاں رہتا تھا + ترک بھی قومی تقلید پر تلے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اس

طرح خلافت کو اپنے ملک میں قائم رہنے دیتے + خلافت
کے متعلق مختلف نقطہ نظر سے اکثر بحث کی گئی ہے لیکن یہاں
اس مسئلہ پر طویل بحث کرنا بے سود معلوم ہوتا ہے - لیکن
جو خیالات اس زمانہ میں ترکوں میں رائج تھے ان کا اظہار
کرنا ضروری ہے + مجلس وطنی کے نزدیک خلافت کا قائم
رکھنا غیر ضروری تھا + جو ترک اس خیال کے پیرو تھے ان کا
طریقہ استدلال یہ تھا - چونکہ حضرت محمد صلعم آخری پیغمبر تھے
اور مذہب اسلام مکمل ہو چکا تھا اس لئے آنحضرت کے بعد
کسی مذہبی پیشوا یعنی مذہبی خلیفہ کی ضرورت نہ تھی + لیکن چونکہ
آنحضرت سیاسی اعتبار سے بھی مسلمانوں کے رہنما تھے اس
لئے ان کے بعد جو خلیفہ جانشین ہوئے وہ دراصل سیاسی
معنوں میں آنحضرت کے جانشین تھے - نہ کہ مذہبی حالت
کے اعتبار سے + خلفاء کے لقب سلطانی کا ایک جزو
"امیر المؤمنین" رہا ہے جس سے بھی سیاسی اقتدار کا اظہار
ہوتا ہے + آنحضرت کی وفات کے بعد تھوڑے ہی عرصہ

میں خلفائے عرب نے ایک وسیع مملکت کو اپنا مقبوضہ بنا لیا تھا اور اس خلافت کی مشرق میں وہی مثال تھی جو ایک زمانہ میں اٹلی کے پوپ کی عیسائی ممالک کے لئے تھی۔ خلفاء عباسیہ کے زوال کے عہد میں بھی جبکہ ان کی مملکت کے متعدد صوبجات خود مختار بن گئے تھے۔ ان کا سیاسی اقتدار اس قدر وسیع تھا کہ صوبوں کے عامل اور نئے فاتحین ان سے رسمی اجازت طلب کیا کرتے تھے اور خواہ برائے نام ہی ہو لیکن ان کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے۔

علاوہ ازیں خلفاء نے مذہبی معاملات میں کبھی ایسی حیثیت اختیار نہیں کی کہ ان کے احکام حتمی و قطعی احکام تصور کئے جاتے۔ فقیہ اور مفتی ہی ہمیشہ ایسے مسائل کی گتھیاں سلجھاتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ مثال موجود ہے۔ جامع ازہر کے علماء نے ۱۸۰۵ء میں متفقہ فتوے کے ذریعہ پاشا مصر کو معزول کر دیا حالانکہ اس کا تقرر منجانب سلطان ترکی ۱۸۰۱ء میں ہوا تھا۔ اور اس کی جگہ محمد علی کا اعلان بطور

پاشا مصر کیا + اپنے فتوے میں ضمناً انہوں نے یہ بھی اعلان
کیا کہ بوقت ضرورت وہ سلطان خلیفۃ المسلمین کو بھی
معزول کر سکتے ہیں + ہلاکو منگول کا نام کسی تعارف کا
محتاج نہیں اس کے وحشیانہ حملوں سے اسلام کی قوت کو جو
نقصان پہنچا اس کی تلافی ناممکن تھی۔ بغداد پر جس بربریت اور
سخت دلی سے ۱۲۵۸ء میں حملہ کیا گیا۔ اس کا ایک نتیجہ خلافت
عباسیہ کا خاتمہ تھا + بغداد کی اس خلافت کے ختم ہونے پر اکثر
مسلم سلاطین نے خلیفہ کا لقب اختیار کر لیا تھا + سلطان
صلاح الدین کے مملوک خاندان نے اپنے تاجداروں کا
خاتمہ کر دیا اور ان کی جگہ ۱۲۵۰ء میں مصر کے بادشاہ بن بیٹھے
تھے۔ انہوں نے اپنی بادشاہت کو جائز تسلیم کرانے کے لئے
خاندان عباسیہ کے پس ماندگان میں سے ایک شخص کو قاہرہ
میں بحیثیت خلیفہ کے مقرر کیا اور اس کے نام پر حکومت کرتے
رہے + آخر کار ۱۵۱۷ء میں عثمانیہ خاندان نے مصر پر قبضہ کر لیا
تو آخری عباسی خلیفہ محمد دوازدہم کو سلطان سلیم اول قسطنطنیہ

لے گیا + کہا جاتا ہے کہ سلطان سلیم نے اس خلیفہ سے اپنے
اور اپنے جانشینوں کے لئے رسمی طور پر خلافت لے تھی اور
محمد و وازہم نے تلوار علم اور عبائے آنحضرت بھی سلیم
کو عنایت کر دیئے تھے + لیکن سلطان سلیم کے پیشیرو بھی اس
لقب کو اختیار کر چکے تھے + جیسا کہ ابھی لکھا گیا ہے۔ درحقیقت
خلافت بغداد کے خاتمہ پر جا بجا مسلم سلاطین نے خلیفہ کا لقب
اختیار کر لیا تھا +

ماضی قریب میں سلطان ترکی کو بحیثیت مذہبی پیشوا
کے سب سے پہلے ۱۷۷۴ء میں پیش کیا گیا جب روس اور ترکی کے
مابین صلح نامہ قرار پایا تھا + اس صلحنامہ کی رو سے اگرچہ سلطان
نے علاقہ کریمیا پر روسی تسلط تسلیم کر لیا تھا لیکن مذہبی اختیارات
مثلاً مفتیوں اور قاضیوں کا تقرر وغیرہ جو شیخ الاسلام استنبول
کے فرائض تھے اپنے لئے مخصوص رکھے تھے اس طرح ۱۹۱۲ء
میں جب اٹلی اور ترکی کے درمیان صلح نامہ قرار پایا تو باوجودیکہ
شمالی افریقہ کے صوبجات طرابلس اور بن غازی پر اٹلی کو قبضہ دیدیا

گیا تھا لیکن مذہبی اختیارات سلطان کے لیے بحیثیت خلیفۃ المسلمین مخصوص رکھے گئے لیکن ان دونوں علاقہ جات میں سلطان کے مذہبی اختیارات بہت جلد سلب کر لئے گئے۔ روس نے کریمیا کو ۱۷۸۳ء میں مکمل طور پر اپنے قبضہ میں لے لیا اور طرابلس اور بنغازی میں ان اختیارات کو صلح نامہ لوزان (۱۹۲۳ء) کی دفعہ ۲۲ کی رو سے منسوخ کر دیا گیا۔ دراصل جہاں کہیں سلطان کے مذہبی اختیارات برقرار رکھے گئے تھے وہاں یہ صاف ظاہر ہو چکا تھا کہ مسلمان خلیفہ کو محض مذہبی پیشوا ہی نہیں بلکہ حاکم مطلق بھی تصور کرتے تھے۔ اسی کا احساس اب حکومت انگورہ کو ہو رہا تھا کہ جب تک خلافت قائم رہے گی ان کی جمہوریت کا رنگ جمنا دشوار ہوگا۔ علاوہ ازیں چونکہ عبدالمجید خاندان عثمانیہ سے تھا اس لئے اس امر کا بھی اندیشہ تھا کہ اگر کسی وقت مخالفانہ انقلاب وقوع میں آیا تو پھر بادشاہت کا قائم ہو جانا ممکن ہوگا۔

کمیٹی اتحاد و ترقی کے مانند قوم پسند جماعت نے

بھی شروع میں طرز حکومت کو تبدیل کرنا مناسب نہ سمجھا تھا اور جب بادشاہت کا خاتمہ کر دیا گیا اسوقت بھی خلافت کو برقرار رکھا گیا۔ سلطان عبدالحمید (۱۸۷۶ء-۱۹۰۹ء) نے بحیثیت خلیفۃ المسلمین اسلامی ممالک میں اپنا ایسا اقتدار قائم کر لیا تھا کہ ترک "خلافت" کو ایک عظیم سیاسی قوت سمجھتے تھے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اس سیاسی حیثیت سے سلطان دیگر اقوام کی نگاہوں میں زیادہ با اقتدار ہو گیا تھا۔ اور اسی وجہ سے ترک اپنے ہاتھ سے اس قوت کو ضائع نہ کرنا چاہتے تھے لیکن ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کے آغاز پر جب کہ ترکوں نے اپنی شرکت کو جہاد قرار دے کر دیگر ممالک کے مسلمانوں سے معاونت چاہی اور ان کو اس میں ناکامی ہوئی اس وقت ان کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ خلافت کی سیاسی اہمیت واقعی اس قدر نہ تھی جیسا کہ وہ سمجھ رہے تھے۔ جنگ عظیم کے اختتام پر مسلمانان عالم اور خاصکر ہندوستانی مسلمانوں نے سلطان ترکی کی ہمدردی میں پھر جد و جہد

شروع اور ترکوں کے لیئے اس طرح خلافت کی اہمیت
از سر نو تازہ ہوگئی + بہرحال اس ہمدردی اور کوشش
سے ترکی کو کوئی فائدہ نہ ہوا اور دول متحدہ پر اس جد
وجہد کا مطلقاً کوئی اثر نہ پڑا۔ چنانچہ ترکوں کی نگاہ میں خلافت
کی سیاسی اہمیت اب اس قدر وقیع نہ تھی + سلطان وحیدالدین
نے حالات کو دگرگوں پاکر ۱۱ اپریل ۱۹۲۰ء کو قوم پسند
جماعت کی علانیہ مذمت کی اور ان کی تحریک کو خلاف مذہب
بتایا، اپنے اس دعوے کی تائید میں وحیدالدین نے شیخ
الاسلام استنبول سے اپنے موافق ایک فتوی بھی شائع
کرا دیا + ان واقعات سے انقلابی جماعت کو خلافت سے
مزید خدشہ پیدا ہوگیا + یہ مسلمہ امر تھا کہ خلیفہ ملک کی اندرونی
سیاست میں بآسانی دخل اندازی کر سکتا ہے۔ اور اسی وجہ سے
مجلس وطنی۔ خلافت کو اور بھی شبہہ کی نگاہ سے دیکھتی تھی +
تاہم سلطان وحیدالدین کی فراری اور بادشاہت کے
خاتمہ پر بھی۔ خلافت کو قائم رکھا گیا + لیکن مزید سولہ ماہ کے

تجربہ سے مجلس وطنی کو یقین ہو گیا کہ خلافت کے قیام سے
اس کا وجود معرض خطر میں رہے گا۔ اور اس لئے اس
خدشہ کو ہمیشہ کے لئے مٹا دینا ہی بہتر سمجھا۔

باب تیرہ
اتحاد اسلامی اور ترکی سلطان بحیثیت خلیفۃ المسلمین

اسلامی معاشرت کا تمامتر انحصار "مساوات اور اخوت" پر رکھا گیا ہے اور جن ممالک میں اسلام اپنی اصلی اور سچی حالت پر قائم ہے وہاں یہ دونوں خصوصیات اسیقدر نمایاں ہیں۔ انہیں اصول کے ماتحت محمود اور ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر رب ذوالجلال کے سامنے سر جھکاتے تھے اور انہیں کا اثر ہے کہ "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کا گیت عالم اسلام میں زبان زد عام ہو رہا ہے۔ المسعودی اور ابن بطوطہ نے دنیائے اسلام کے سارے عرض و طول میں سفر کیا۔ غیر ممالک میں برسوں قیام پذیر رہے۔

لیکن کسی جگہ بھی اپنے کو بیگانہ محسوس نہ کر سکے + ایک مصری عرب نیو یارک جاتے ہوئے عرشۂ جہاز سے جبرالٹر کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں طارق کے اسلامی گہوارے کی یاد تازہ ہو جاتی ہو اور اس کی مدح سرائی میں بے اختیار رطب اللسان ہو جاتا ہے + اسی طرح جب اقبال انگلستان سے واپس ہوتے ہوئے سسلی کے سواحل سے گذرتا ہو تو اس کو پرانی اسلامی عظمت کے آثار نظر آنے لگتے ہیں وہ خود کو انہیں عرب فاتحین کا جانشین تصور کرنے لگتا ہے اور جذبہ کے عالم اس کی زبان سے یہ اشعار جاری ہو جاتے ہیں:۔

رُو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے

بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے"

یہ انہماک۔ یہ جوش اور یہ اضطراب جو ان اشعار سے ٹپکتا ہے دراصل اخوت اسلامی ہی کا کرشمہ ہے۔ جس زمانہ میں ایرانی شعرا اور فضلا مشہور عالم تھے ان کو اسلامی دنیا میں ہر جگہ خوش آمدید کہا جاتا تھا اور ہر جگہ ان کی عزت کی جاتی تھی۔ قاہرہ کے فاطمیوں۔ بغداد کے عباسیوں قرطبہ کے امویوں قسطنطنیہ کے عثمانیوں اور دہلی کے مغلوں کے درباروں میں ان کی وہ آؤ بھگت کی گئی کہ جو انہیں اپنے وطن میں بھی نصیب نہ ہوتی تھی اور ان لوگوں کے بھی ان غیر ممالک میں وہ دل لگے کہ اکثر نے پھر وطن کا رُخ تک نہ کیا۔ یہ سب اسی اخوت اسلامی کی زندہ مثالیں ہیں جو ہمیشہ تاریخ میں قائم رہیں گی۔

لیکن یہ اخوت اسلامی ہرگز سیاسی اتحاد نہ تھا

بلکہ ایک واحد اور جہانگیر تمدن کی ہم آہنگی و یکرنگی سے اس کو تعبیر کر سکتے ہیں + اتحاد اسلامی کی تحریک جو محض سیاسی حیثیت رکھتی ہے زمانہ حال سے متعلق ہے اور اس سے قبل کبھی اس شکل میں رونما ہوئی تھی۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ سیاسی مشکلات میں پھنس کر چند ممالک اور بالخصوص ترکی نے اخوت اسلامی کو اتحاد اسلامی کا جامہ پہنا کر صف اعدا کے مقابل لا کھڑا کیا اور ایک عرصہ تک دول یوروپ اس تحریک کی فرضی ہیبت سے لرزتے رہے + یعنی اپنی کمزوری کے باوجود "اتحاد اسلامی" کی بدولت جس کے پس پردہ جہاد کی دھمکی بھی مضمر ہوتی تھی ترکی مدتوں تک دول یورپ کے دستبرد سے مامون رہی + اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ اسلامی دنیا میں رشتۂ یگانگت "خلافت" کی بدولت قائم رہا ہے کیونکہ آنحضرت محمد صلعم کے تقریباً ایک صدی بعد ہی عالم اسلام میں ایک سے زیادہ حکمران رہے ہیں جو "خلیفہ" کے لقب کے حامل یا دعویدار تھے + چنانچہ مصر کے فاطمیوں نے کبھی خلفاء عباسیہ بغداد کی سیادت

تسلیم نہیں کی اور اسی طرح ہندوستان کے مغل شہنشاہوں اور مراکش کے سلاطین نے بھی عثمانی ترک سلاطین کی خلافت کو نہیں مانا + "خلافت" اور اتحاد اسلامی کی یہ اہمیت نئی ہے اور حال ہی میں پیدا ہوئی ہے اور اس کے لئے اسباب بھی مہیا ہو گئے تھے +

اتحاد اسلامی کے لئے سب سے پہلی کوشش سرزمین نجد سے شروع ہوئی + اسلامی دنیا میں عام انحطاط کو دیکھ کر شیخ عبد الوہاب نے اٹھارہویں صدی کے آخری ثلث میں اصلاحی تحریک کا آغاز کیا + یہ تحریک اکثر ممالک میں مقبول ہوئی اور خاصکر ہندوستان میں اس کا اثر حاجی شریعت اللہ بنگالی اور سید احمد بریلوی کے وساطت سے بہت جلد پھیلا۔ لیکن مجموعی حیثیت سے یہ تحریک بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے عمومیت کا درجہ نہ لے سکی اور سرزمین نجد ہی میں محدود ہو گئی + بعد ازاں ۱۸۲۷ء میں الجزائر کے ایک قاضی سید محمد ابن علی السنوسی نے فرقہ سنوسیہ قائم کیا + امام محمد بن سنوسی نے مسلمانوں کی کمزوری کے اسباب

وعلل اور مغربی سیاسی چالوں کا بغور مطالعہ کیا تھا+امام محمد نے شیخ عبدالوہاب سے نجد میں ملاقات کی + اس فرقہ کی کوششیں اتحاد اسلامی کا جذبہ پھیلانے میں بہت کامیاب ثابت ہوئیں اور جملہ ممالک میں اس فرقہ کا اثر قائم ہو گیا +

شمالی افریقہ میں اٹلی کی مشکلات کا ذمہ دار یہی فرقہ ہے اور اسی کی وجہ سے اٹلی باوجود اس قدر سیاسی و جنگی طاقت کے آج تک طرابلس پر پورا قبضہ نہیں کر سکا + یونانی غاصبانہ حملہ کے خلاف اناطولیہ میں اتحاد قائم کرنا بھی سنوسیت ہی کا کرشمہ تھا+ لیکن اس تحریک نے بھی ایک خصوصی پہلو اختیار کر لیا جس کے باعث اس کو عمومیت کا درجہ حاصل نہ ہو سکا +

یہ دونوں تحریکیں اگرچہ اتحاد اسلامی کیلئے بھی کوشاں رہیں لیکن دراصل مذہبی تھیں۔ البتہ سید جمال الدینؒ افغانی

سلہ سید جمال الدین کے حالات بیشتر دو کتابوں سے لئے گئے ہیں "انقلاب ایران" مصنفہ پروفیسر ای۔جی۔براؤن۔اور "جمال الدین افغانی" مطبوعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی +

کے عروج کے ساتھ ایک ایسی تحریک کا آغاز ہوا جس پر سیاسی رنگ غالب تھا اور جس کا تمام تر مقصد مسلمانانِ عالم کو ایک مضبوط سلسلہ میں منسلک کر دینا تھا تاکہ دول یورپ کی متناقض اور مخالف کوششیں بیکار ہو جائیں۔ سید جمال الدین ۱۸۳۹ء میں بمقام اسد آباد پیدا ہوا۔ اس کے والد سید صفدر۔ سید علی الترمذی محدث کی اولاد میں تھے۔ بچپن ہی سے کابل میں بود و باش اختیار کر لی تھی اور بڑے ہونے پر اس کا تعلق دربار سے ہو گیا۔ جمال الدین ۱۸۶۹ء میں افغانستان سے باہر نکلا۔ ہندوستان ہوتا ہوا مصر گیا اور وہاں سے قسطنطنیہ پہنچ گیا۔ جمال الدین کے فیض سے مصر مدت تک مستفید ہوتا رہا بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کے بعد سید نے یورپ کے ممالک میں بھی سفر کیا ایک عرصہ تک لندن اور پیرس میں اور پیٹرو گراڈ میں مقیم رہا۔ اسی طرح سے وہ مغرب کی سیاسی ریشہ دوانیوں سے بخوبی واقف ہو گیا تھا۔ سید کی تمام زندگی اسلام کی خدمات کرتے گذری۔ روس میں مسلمانوں کو کلام مجید اور دیگر

مذہبی کتابوں کے شائع کرنے کی اجازت نہ تھی سید نے
زار روس سے ملاقات کی اور آیندہ کے لیئے مسلمانوں پر
سے یہ بندش اٹھادی گئی + لندن اور پیرس میں بھی سید اسلامی
مفاد کے لیئے کوشاں رہا + پیرس میں سید نے ۱۳۰۱ھ میں ایک
ہفتہ وار اخبار ” عروۃ الوثقیٰ “ جاری کیا جس کا فرانسیسی نام ” لی
لائن اندسا لول “ تھا۔ اور کچھ عرصہ لندن میں ایک اور عربی
اور انگریزی اخبار ۱۳۰۹ھ میں جاری کیا جس کا نام ” ضیاء
الخافقین “ تھا + یہ دونوں اخبار اسلامی سیاسیات پر
بحث کرتے تھے لیکن ان دونوں کو اسقدر مخدوش سمجھا
گیا کہ جلد ہی کسی نہ کسی طرح دول یورپ کی سازشوں نے
ان کا خاتمہ کر دیا + آخر زندگی یعنی ۱۸۹۲ء میں سید قسطنطنیہ چلا
گیا اور وہاں سلطان عبدالحمید نے اس کو شاہی مہمان رکھا
اس کے لیئے ایک گران قدر وثیقہ مقرر کر دیا + پانچ سال کے
بعد ۱۸۹۷ء میں سید نے انتقال کیا اور اس وقت شبہہ کیا جاتا
تھا کہ سید کو زہر دیکر ہلاک کر دیا گیا۔ عبدالحمید نے سید کی بہت خاطر

و مدارات کی کیونکہ عبدالحمید جانتا تھا کہ سید کے وسیلہ سے وہ اپنی بادشاہت کو مستحکم کرسکتا ہو + اتحاد اسلامی کے علمبرداران میں مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم دیوبندی بھی جو شیخ الہند کے لقب سے معروف ہوئے قابل ذکر ہیں ان کی تحریک زیادہ پیمانہ پر نہ پھیل سکی اور مالٹا میں نظر بندی کے باعث ان کو زیادہ کام کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا +

مختصراً سید جمال الدین کی تعلیم کا لب لباب یہ تھا کہ عیسائی دنیا باوجود اپنے اندرونی اختلاف کے اسلام کی سخت جانی دشمن ہو۔ اور تمام اسلامی ممالک کو تباہ کرنے کے لئے متحد ہوگئی ہے۔ سید کا یہ خیال محض وہم نہ تھا۔ بلکہ اس کی تصدیق اس زمانہ کے خود عیسائی مدبرین کے قول سے ہوتی ہے + لارڈ لٹن ۱۸۶۳ء تا ۱۸۷۶ء جس وقت وائسرائے مقرر ہو کر ہندوستان آرہا تھا اس کی اور شورآلاف روسی سفیر متعینہ لنڈن کی گفتگو مشرقی حالات پر ہوئی + شورآلاف نے اس امر پر زور دیا کہ روسی ترکستان کا گورنر جنرل اور

ہندوستان کا وائسرائے دوستانہ تعلقات قائم رکھیں اور براہ راست متفق ہو کر عمل پیرا ہوں تو بدرجہا سودمند ہو گا۔ اور اگر دونوں متحد ہو کر چاہیں تو مسلم اعدار کو بہت جلد نیست و نابود کر سکتے ہیں شورٹلاف نے صاف الفاظ میں کہا کہ روس اور انگلستان کا اصلی دشمن اسلام ہے[۱]۔ سید نے بخوبی سمجھ لیا تھا کہ صلیبی لڑائیوں کی روح زمانہ حال میں بھی قائم و برقرار رہے۔ اور پیٹر اعظم کے تعصبانہ خیالات بھی اسی قدر تازہ ہیں۔ جس کی بنا پر عیسائی دنیا کھلم کھلا اسلام کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس کی ایک مثال بین الاقوامی قانون ہے۔ جس میں مسلم اقوام کو عیسائی اقوام کے مساوی درجہ عطا نہیں کیا گیا۔ زمانہ حال میں جیسا ایک گذشتہ باب میں تحریر کیا گیا ہے۔ عیسائی سلطنتوں کی ذہنیت کا پتہ جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بعد کے واقعات سے چلتا ہے۔ ترکی کے خلاف پے درپے خفیہ معاہدہ کئے گئے کہ اس کا خاتمہ کر دیا جائے اور حالانکہ اس

---

(۱) تاریخ ہندوستان ۱۸۵۸ء تا ۱۹۱۸ء مولفہ ایچ۔ ڈاڈویل ص ۱۲۵ مطبوعہ ۱۹۲۵ء۔

مقصد میں ناکامی ہوئی لیکن پھر بھی عثمانیہ مملکت کے ٹکڑے اُڑا دیئے گئے۔ سید پر عیاں ہو چکا تھا کہ عیسائی دنیا ہر اسلامی جذبہ اور خواہش کا مذاق اُڑاتی ہے اور اسے ذلیل سمجھتی ہے۔ اہل مغرب جس جذبہ کو اپنے لئے "قومیت" کا مترادف سمجھتے ہیں اسی کو مسلمانوں میں "تعصب" سے تعبیر کرتے ہیں اور جو ان کے لئے "خودداری" اور تمکنت ہو وہ اہل مشرق کے لئے "جنگ جویانہ خصلت" قرار پائی ہے۔ چنانچہ سید نے تلقین کی کہ ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے تمام دنیائے اسلام کو ایک وسیع دفاعی اتحاد میں منسلک ہو جانا چاہیئے۔ ورنہ اس کی ہستی معرض خطر میں پڑ جائے گی۔ اس مقصد کے حصول کیلیئے یہ ضروری ہے کہ دول مغرب کی ترقی اور طاقت کے راز کو معلوم کیا جائے اور اس راز کے ذرائع تعمیر و تخریب پر مکمل دسترس حاصل کی جائے۔

اب تک یہ عیاں ہو گیا ہو گا کہ اسلامی دنیا میں انحطاط کا احساس اٹھارہویں صدی سے شروع ہو گیا تھا اور متواتر

ایسے واقعات پیش آتے رہے کہ جن کے باعث یہ احساس
ہمہ گیر ہوتا گیا۔ اس احساس کے ساتھ مختلف مقامات سے
اسلام کی بہتری کے لئے تحریکیں بھی برپا کیجا رہی تھیں۔ علاوہ
مذہبی پہلو کے یہ تحریکیں سیاسی نقطۂ نظر سے بھی اہمیت رکھتی
تھیں۔ آخر کار سید جمال الدین نے صاف طور پر اعلان کر دیا
کہ اسلامی دنیا کو اپنی ہستی قائم رکھنے کے لئے دفاعی اتحاد
قائم کرنا چاہیئے۔ اسلامی ممالک میں سے ترکی ہی کا سابقہ اہل
یورپ سے زیادہ پڑتا تھا۔ چنانچہ ترکی ہمیشہ دول یورپ کی
آنکھوں میں کھٹکتی رہی۔ ترکی میں بھی زوال کے اسباب
نظر آ رہے تھے اس لئے سیاسی حیثیت سے "اتحاد اسلامی" کی
اہمیت ترکی کے لئے اور بھی زیادہ تھی۔ علاوہ ازیں سلطان
ترکی کو عام طور پر خلیفۃ المسلمین تصور کیا جاتا تھا، اور اس وجہ
سے ترکی کی جانب اور بھی زیادہ توجہ منعطف ہوتی تھی۔ مزید
برآں دیگر بڑی بڑی سلطنتوں کا کم و بیش خاتمہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ
بیشتر مسلمانوں کی نگاہیں ترکی ہی پر لگی ہوئی تھیں۔ ہسپانیہ میں

میں اسلامی عظمت کی یادگار محض آثار شکستہ سے قائم تھی +
طرابلس پر اٹلی کا اقتدار روز بروز بڑھ رہا تھا اور مصر اپنی
آزادی اپنے ہاتھوں کھو رہا تھا + ایران روس کے غاصبانہ
تصرفات سے پریشان ہو چکا تھا اور وسط ایشیا کی آزاد
اسلامی سلطنتیں یکے بعد دیگرے معدوم ہو رہی تھیں چینی
مسلمانوں کا حال ابتر ہو رہا تھا اور افغانستان میں خود
بدامنی پھیل رہی تھی + سلطنت مغلیہ جو عروج کے زمانہ میں دولت
عثمانیہ کے ہم پلہ تھی بستر مرگ پر آخری سانس لے رہی تھی +
الغرض عالم اسلام میں ہر جگہ تباہی کے آثار نمایاں ہو رہے
تھے + ترکی اس سے مستثنیٰ نہ تھی۔ لیکن اس کی حالت دیگر ممالک
سے بہتر تھی۔ چنانچہ بقیہ مسلمانوں کی نگاہیں ترکی پر جمی ہوئی تھیں +
برخلاف اس کے عیسائی اقتدار، مصر، ایران، ہندوستان وغیرہ
میں ہر طرف فروغ پا رہا تھا۔ اور سید جمال الدین کے خیال
کے مطابق دول مغرب کوشاں تھے کہ مشرقی اقتدار کو ہمیشہ
کے لئے زائل کر دیا جائے +

صورت حالات یہ تھی کہ جب سلطان عبدالحمید (۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۹ء) نے ترکی میں عنان حکومت سنبھالی تو ملک کی اندرونی فضا مدحت پاشا کے نئے خیالات کی وجہ سے مکدر ہو رہی تھی۔ اور بیرونی مداخلت کا اندیشہ بھی ہر لحظہ پیش نظر تھا۔ عبدالحمید نے اسلامی دنیا کی ذہنیت کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم کر لیا تھا کہ دول یورپ کی نگاہوں میں اس کا اقتدار بہ نسبت محض سلطان ترکی ہونے کے بحیثیت خلیفۃ المسلمین زیادہ اچھی طرح جم سکتا ہے۔ چنانچہ عبدالحمید نے اس واقعہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ بحیثیت "خلیفۃ المسلمین" عبدالحمید نے نہ صرف دول یورپ ہی کو دھمکی میں رکھا بلکہ اندرونی معاملات میں بھی اس سے فائدہ اُٹھاتا رہا۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہ تھی عبدالحمید کے علاوہ اور سلاطین ترکی بھی منصب خلافت سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ معاہدہ روس اور ترکی ۱۷۷۴ء کی رو سے ترکی نے کریمیا پر روس کو قبضہ دید یا تھا لیکن مذہبی حیثیت سے وہاں کے مسلمان باشندوں پر سلطان کا اقتدار برقرار رکھا گیا تھا اسی

طرح ۱۹۱۲ء میں شمالی افریقہ میں طرابلس اور بنغازی پر اٹلی
کا تسلط ہونے پر بھی سلطان کو بحیثیت مذہبی پیشوا تسلیم کیا گیا
تھا + سلطان عبدالحمید نے بالخصوص اتحاد اسلامی کے پردے
میں ترکی کو مدت تک بیرونی حملوں اور اندرونی سازشوں
سے بچائے رکھا + حجاز ریلوے کی تعمیر نے عبدالحمید کو مسلمانان
عالم کی نگاہوں میں اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ اس طرح بغیر
زیادہ خرچ کئے ہوئے ریلوے لائن بھی تعمیر ہو گئی اور عبدالحمید
کو عام مقبولیت بھی حاصل ہو گئی تھی + ہندوستان سے خاصکر
بہت مدد دی گئی۔ کیونکہ مغلیہ خاندان کے ختم ہونے پر
ہندی مسلمان ترکوں کو خاص تعلق کی نگاہ سے دیکھتے تھے
اور سلطان کو خلیفہ جان کر اس کی بڑی عظمت کرتے تھے +

"اتحاد اسلامی" کی تحریک میں جہاد کی دھمکی بھی مضمر
تھی اسلامی جوش کے پرانے واقعات دول یورپ کے
ذہن میں موجود تھے + چنانچہ وہ اس دھمکی سے اس قدر خائف
رہتے تھے کہ باوجود ترقی اور وسیع اقتدار کے ان کی

ہمت نہ پڑتی تھی کہ منفقہ صورت سے اسلام پر کھلم کھلا حملہ آور ہوں + علاوہ ازیں مسلمانوں کی کثیر تعداد پر برطانیہ اور دیگر عیسائی سلطنتیں حکمراں ہوگئیں تھیں اور ان کو اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں "جہاد کے ماتحت اسلامی ممالک میں مشکلات سے دوچار ہونا نہ پڑ جائے + جنگ بلقان میں ترکوں کی مدد کے لیے ہندوستان سے کثیر رقم بھیجی گئی۔ اور ایک طبی وفد بھی روانہ کیا گیا + ان واقعات کو دیکھکر دول یورپ کو یقین ہوگیا تھا کہ اگر کبھی جہاد کا اعلان ہوگیا تو تمام اسلامی دنیا میں ہلچل مچ جائے گی + چنانچہ جب گذشتہ جنگ عظیم کا ۱۹۱۴ء میں آغاز ہوا تو یہ ڈر اور بھی زیادہ لاحق ہوگیا + نوجوان ترکوں نے عبدالحمید کے اثر سے فائدہ اٹھانا چاہا اور شیخ الاسلام سے فتوے لے کر جہاد کا اعلان کر دیا۔ لیکن غیر ممالک میں کوئی شورش تک نہ ہوئی + اور "اتحاد اسلامی" کی تحریک سیاسی حیثیت سے ظاہرا ناکامیاب ثابت ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ جس کے باعث نوجوان ترک خلافت کو مٹانے کے درپے ہو گئے

لیکن اس ظاہرا ناکامی کی کئی وجوہات تھیں۔ اول تو ترکوں نے جنگ میں شمولیت بغیر اور اسلامی ممالک کے مشورہ کے کی تھی۔ بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اسکی خلاف رائے کا اظہار بھی کیا تھا۔ دوئم ترکی کی شرکت مدافعانہ نہ تھی اور سلطنت کا قیام معرض خطر میں نہ تھا۔ اس لئے وہ جذبات جو ایسی صورت میں موجزن ہوتے ہیں اس وقت مفقود تھے۔ سوئم جنگ عظیم عیسائی دول کے مابین شروع ہوئی اور ترکی کے شریک جرمنی اور آسٹریا بھی عیسائی تھے۔ اس جنگ کے آغاز میں بالتخصیص اسلامی دنیا پر کوئی حملہ مقصود نہ تھا۔ اس لئے عوام کے نزدیک یہ جنگ "جہاد" کا حکم نہ رکھتی تھی۔ چہارم جہاد کا فتویٰ محض شیخ الاسلام ترکی نے صادر کیا تھا اور اس فتوے کے نافذ کرنے میں دیگر ممالک کے علماء سے کوئی مشورہ نہیں لیا گیا تھا۔ اس لئے مختلف ممالک اسلامیہ نے خود کو فتویٰ جہاد کی قیود کا پابند نہ سمجھا۔ مزید برآں عربی صوبجات میں ترکی حکومت کے خلاف عام احساس بیگانگی موجود

تھا۔ اس وجہ سے عربوں نے خوشی سے جنگ میں کوئی مدد نہ دی بلکہ آخرکار علم بغاوت بلند کر دیا۔

ان واقعات سے ترک بھی دل برداشتہ ہو گئے اور انہوں نے "اتحاد تورانی النسل اقوام" کی ایک اور تحریک شروع کر دی جس کا مقصد تورانی النسل اقوام کا متحدہ کرنا تھا۔ برطانیہ نے اس موقعہ کو غنیمت جان کر عربوں کو اور بھی بھڑکا دیا۔ تورانی النسل اقوام کا اتحاد بھی ناکامیاب رہا! اور ادہر عرب میں بغاوت عام ہو گئی جس کا انجام یہ ہوا کہ عرب صوبجات آزاد ہو گئے۔ چنانچہ اب بجائے "اتحاد اسلامی" کے ان ممالک میں "تحریک وطنی" نے زور پکڑا اور ہر جگہ "قومیت" کا خیال فروغ پانے لگا۔ ایران میں پہلے ہی سے قومیت اتحاد اسلامی کے جذبہ پر غلبہ پا چکی تھی اور وہ خیال کہ جسے فردوسی نے مندرجہ ذیل اشعار میں ادا کیا تھا ہنوز ایرانی دلوں سے محو نہ ہوا تھا:۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسیدست کار

کہ تخت کیاں را کند آرزو — نفوذ برتوای چرخ گرداں نفو

لیکن اب مصر۔ ترکی۔ عرب اور افغانستان میں بھی "قومیت" کا استحکام فرض اولین سمجھا جارہا ہے۔ دول یورپ کی تمنائیں ایک حد تک پوری ہوچکی تھیں۔ اور اگرچہ اسلامی دنیا کو نیست ونابود کرنے میں وہ ناکامیاب ثابت ہوئیں۔ لیکن اسلامی ممالک کے سیاسی اتحاد کو ضرور زائل کرچکی ہیں۔ "خلافت" کا نام نہاد منصب۔ عہد گذشتہ کی یادگار بن چکا ہے اور ظاہرا اب کوئی ایسی مرکزی تحریک موجود نہیں کہ جو مسلمانان عالم کو متفق کرسکے۔ اس انتشار کا نتیجہ عیاں ہے ایک صدی قبل یونان کی معاونت میں تمام یورپ کی عیسائی سلطنتوں نے بلاتخصیص ملک و ملت متفق ہوکر ۱۸۲۹ء میں اس کو ترکی مملکت سے آزاد کردیا تھا اور آج طرابلس اور بنغازی میں اطالیوں کے مظالم کے خلاف کسی مسلمان حکومت کی مجال نہیں کہ آواز تک بلند کرے۔

خلافت ختم ہوگئی اور اتحاد اسلامی ناکامیاب ثابت

ہوا۔ لیکن کیا کوئی اور مذہبی مرکز ایسا نہیں کہ مسلمانوں کو مجتمع کر سکے؟ اور کیا اتحاد اسلامی کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہدینا چاہیئے؟ ان دونوں سوالوں کا تعلق مستقبل سے ہے لیکن کچھ آثار ایسے نمایاں ہو رہے ہیں کہ جن سے مستقبل کی بابت کافی وثوق کے ساتھ رائے زنی کیجا سکتی ہے + خلافت کے ختم ہوتے ہی مسلمانان عالم کی کوشش سے موتمر جیسی وسیع اور مہتم بالشان کانفرنس قائم ہوگئی + حج کے زمانہ میں تمام اسلامی دنیا کے نمائندے بیت اللہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور اسی زمانہ میں موتمر کا اجلاس منعقد ہوتا ہے ہرچند موتمر کا اب تک کوئی کارنمایاں ظہور میں نہیں آیا لیکن اس کا مستقبل ضرور امید افزا ہے اور اس کے وسیلہ سے اسلامی دنیا میں وہ نظم ونسق قائم ہوسکتا ہے کہ جو بین الاقوامی مجلس بھی نہیں کر سکتی + تحریک" وطنی" سے کسی قسم کا اندیشہ نہ ہونا چاہیئے + وطن سے محبت رکھنا اسلامی شعار ہے اور "حب الوطن من الایمان" ہر مسلمان کا فرض ہے + علاوہ

ازیں جب تک ایک قوم بذات خود طاقت ور نہ ہوگی وہ کسی طرح دوسری قوم کو ضرورت کے وقت مدد نہیں دے سکتی۔ زمانہ حال کی مثالیں موجود ہیں۔ مصر طرابلس کا ہمسایہ ہے ترکی بھی دور نہیں لیکن یہ دونوں طرابلس کے واقعات پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے اگر بغور دیکھا جائے تو اتحاد اسلامی کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہر مسلم ملک خستہ اور تباہ حال ہو چکا تھا اور بجائے دستگیری کرنے کے دوسروں کا دست نگر رہنا پسند کرتا تھا ترکی کی حالت مقابلتاً سب سے بہتر تھی لیکن پھر بھی ایک حجاز ریلوے کی تعمیر تک اس کی بساط سے باہر تھی۔ برخلاف اس کے دول یورپ اور امریکہ ہر جگہ متعدد ریلوے لائن کھولنے پر فوری قدرت رکھتے ہیں۔ جنگ بلقان کے دوران میں ہندوستان جیسے غریب اور کمزور ملک نے ترکی کی معاونت کی۔ لیکن جب ۱۸۲۵ء میں یونان نے علم بغاوت بلند کیا تو تمام عیسائی طاقتیں اس کی مددگار بن گئی تھیں۔ اس لئے موجودہ زمانہ میں اصل "اتحاد اسلامی" یہی ہے کہ ہر مسلم

ملک اول اپنے آپ کو آزاد اور طاقتور بنائے اور بجائے دوسروں کا دست نگر ہونے کے اس بات کے لئے کوشاں ہو کہ اور ممالک کی دستگیری کر سکے + امید ہے کہ اس قومی استحکام کے بعد جو اتحاد اسلامی کا رابطہ قائم ہو گا وہ اسقدر مضبوط اور استوار ہو گا کہ غیر اقوام کو اسلامی دنیا پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ پڑے گی + اس لئے زمانہ حال میں مسلم ممالک کا فرض ہونا چاہئے کہ اتحاد اسلامی کا احساس دل میں لئے ہوئے وہ اپنی قوم کو ازاد اور طاقتور بنانے میں کوشاں ہو جائیں +

باب چودہ
ترکی جمہوریت اور اس کا مختار مطلق

ایک ملک میں آئینی حکومت اس وقت قائم ہو سکتی ہے جبکہ عوام الناس میں خود اس کے حصول کا احساس موجود ہو اور اس کے لیے تعلیم کا عام ہونا لازمی ہے + سلطان عبدالحمید نے ۱۸۷۶ء میں آئینی حکومت کو قائم کیا لیکن اس سے ملک میں کوئی اصلاح نہ ہونے پائی تھی کہ پھر طرز حکومت بدل گئی + نوجوان ترکوں کی تحریک میں عوام الناس کو کوئی اقتدار نہیں دیا گیا تھا اس لیے آئینی حکومت کا احساس عوام میں اسوقت نہ پھیل سکا + اس زمانہ میں مختلف مذاہب اور اقوام کے افراد ترکی میں آباد تھے۔ اور جداگانہ معاشرت و تمدن کی بنا پر ان میں ایک قومیت پیدا کرنا محال تھا + ۱۹۰۸ء میں سلطان کی ترغی

سکے خلاف آئینی حکومت پھر وجود میں آئی + لیکن ظاہر ہی
کہ اس وقت عوام الناس آئینی حکومت کے لیئے تیار نہ تھی
ورنہ ان کی آزادی اور ان کے حقوق اس قدر جلد سلب
نہ کرلیئے جاتے + ترکی کی یہ تیسری کوشش ہی اور ہر چند
ترکوں میں عام سیاسی آزادی کا احساس پیدا ہوتا جا رہا
ہے لیکن مدت العمر کے خیالات کا دفعتًا تبدیل ہونا آسان
نہیں ہے۔ اس لئے ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ موجودہ طرز حکومت
کب تک مستقل شکل اختیار کر سکے گی + ترکی میں اگرچہ جمہوریت
قائم ہو چکی ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل اقتدار
چند افراد کے ہاتھوں میں ہے جو حکومت کی باگ سنبھالے
ہوئے ہیں + مصطفیٰ کمال نے تمام قومی فوج پر اپنا اثر قائم
کر رکھا ہے اور اناطولیہ کے باشندگان اس کے خاص طور
پر مداح ہیں اور اسی کے باعث اس کا اقتدار سب پر حاوی
ہے + اپنے اس رسوخ کی بنا پر اس نے وہ قوت حاصل کر لی
تھی کہ بیرونی حملہ آوروں کو ملک سے باہر نکال دیا بادشاہت

اور خلافت کو یک قلم موقوف کر دیا اور دیگر ممالک کی حکومتوں
کا نہایت بیباکانہ مقابلہ کیا + ترکی کی اندوہناک شکست کے
پانچ سال بعد اس نے وہ جنگی اور سیاسی فتوحات حاصل
کیں کہ تمام دنیا متحیر رہ گئی + بعد ازاں مصطفیٰ کمال نے جمہوریت
کا اعلان کیا اور خود حکمرانی کرنے لگا اس کی مثال انگلستان
کے کرامویل (۱۶۴۹ء تا ۱۶۶۰ء) یا فرانس کے نپولین (۱۸۱۵ء)
یا اٹلی کے موجودہ خود مختار مطلق موسیولینی کی سی ہے۔ کہ جنہوں
نے ایک نئی طرز حکومت قائم کی اور خود عنان حکومت
سنبھالی + مصطفیٰ کمال کے بعد اس کے ناظم فوج عصمت پاشا
کا نام قابل ذکر ہے۔ جس نے اپنی قابلیت کا ثبوت عرصۂ
کارزار اور میدان سیاست دونوں میں برابر دیا ہے +
حکومت کا تمام تر انحصار در اصل انہیں دو اشخاص پر رہا ہے
اور ان کے احکام کی تعمیل فوج اور پولیس نہایت وفادارانہ
طریقہ پر کرتی رہی ہے + صدر جمہوریت منتخب ہونے کے بعد
مصطفیٰ کمال ترکی کا مختار مطلق بن گیا اور عصمت پاشا وزیر اعظم

کی حیثیت سے اس کا معاون و مددگار رہا۔ چنانچہ جمہوریت کے اولین دور میں کوئی مخالف فریق وجود میں نہیں آیا۔ حکومت ہر دلعزیز تھی اور اس کا اقتدار سب پر حاوی تھا۔ مصطفےٰ کمال نے اسی دوران میں تقریر کرتے ہوئے طرابزون میں کہا "میں جمہوریت کا طرفدار ہوں اور یہ تصور ہی نہیں کرسکتا کہ کوئی ترک اس کے علاوہ بھی خیال رکھ سکتا ہے"۔ چند دنوں بعد اس نے پھر سمسون میں کہا "قوم پسند جماعت کا مطمح نظر تمام قوم کو ایک بنا دینا ہے اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ جمہوریت کی متفقہ طور پر معاونت کی جائے تاکہ عوام الناس میں تعلیم اور معاشرتی اصلاح جلد از جلد پھیل سکے۔ اتحاد لازمی ہے۔ اور اس کے متعلق کوئی متنازعہ خیالات یا متنازعہ گروہ نہیں ہو سکتے"۔ یہ وہی نظریہ ہے جس کا اعادہ اٹلی میں موسیولینی کرتا رہا ہے اور اس لحاظ سے مصطفےٰ کمال اور موسیولینی میں مشابہت ذہنی پائی جاتی ہے۔ حکومت کے مرکزی شکل اختیار کرنے کا لازمی نتیجہ تھا کہ اعتراضات اٹھائے

جاتے اور مخالفت کی جاتی + مخالف اخبارات نے سختی کے
ساتھ جدوجہد شروع کر دی۔ اور معین زاہدبے نے جو اخباری
دنیا میں ممتاز ہستی رکھتا ہے۔ صاف اعلان کر دیا کہ ملک
میں مطلق العنانی قائم ہوا چاہتی ہے اور بجائے صدر جمہوریت
کے ان کو ایک مختار مطلق سے سابقہ پڑنیوالا ہے + حکومت کو
شبہہ کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ اور صدر جمہوریت کے وسیع
اختیارات میں تخفیف کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی + صدر
کو احکامات منسوخ کرنے کا اختیار محض مشروط طریقہ پر دیا
گیا + مصطفےٰ کمال کی کوشش تھی کہ وہ صدر جمہوریت ہونے
پر بھی اپنی جماعت کی رہبری کر سکے کیونکہ اس کا دعویٰ تھا
کہ وہ جمہوریت کو مستقل بنا سکتا ہے اور یہ کہ اس کی جماعت اور
حکومت اور قوم کے خیالات میں کوئی اختلاف نہ تھا + مجلس
وطنی کے اجلاس ایک سال میں چار ماہ تک منعقد ہوتے ہیں
اور بقیہ زمانہ میں عاملانہ اختیارات صدر جمہوریت اور اسکے
وزراء سے وابستہ رہتے ہیں + چنانچہ یہ عاملانہ اختیارات

نہایت وسیع ہیں اور شاید اس کی مثال کسی اور جمہوریت
میں نہیں مل سکتی + صدر کی مطلق العنانی کی ایک مثال ترکی
اخبارات پر بیجا پابندیاں عائد کرنا ہے + دسمبر ۱۹۲۳ء میں
ایک خاص عدالت قائم کی گئی تھی جس کے اختیارات
فرانسیسی اور روسی عدالتوں کے مانند تھے جو ایسے ہی مقصد
کے لیئے وجود میں آئی تھیں + باغیانہ خیالات کو مٹانے کے
بہانہ اس عدالت نے ہر قسم کی زیادتیاں روا رکھیں اور مخالف
جماعت پر ہر طرح کا دباؤ ڈالا + قسطنطنیہ کے تین اخباروں
کو ابتدا ہی میں بند کر دیا اور ان کے مدیروں کو قید خانہ میں
ڈال دیا محض اس وجہ سے کہ انہوں نے اُس خط کو قبل از
وقت شائع کر دیا تھا جو ہز ہائنس آغا خاں اور رائٹ آنریبل
سید امیر علی نے مسلمانان ہند کی جانب سے عصمت پاشا کو
خلافت کا اقتدار قائم رکھنے کے لیئے لکھا تھا + اس کے بعد
فوراً ہی جنوری ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ شکری بے کو جو قسطنطنیہ کے
وکلاء کی جماعت کا صدر تھا ایک مضمون لکھنے پر پانچ سال کی

سزا کا حکم دیا۔ اگرچہ قلیل مدت کے بعد رہا کر دیا گیا۔ اسی طرح کئی اور اخبارات کی اشاعت جنمیں ایک انگریزی اخبار "اُورینٹ نیوز" بھی تھا۔ بند کر دیئے گئے اور متعدد مدیروں کو جیل خانہ میں بھیج دیا گیا۔ جنوری ۱۹۲۵ء میں یونانی عیسائی پیشوا کو دفعتاً ملک سے چلے جانے کا حکم دیدیا گیا اور اس کو چوبیس گھنٹہ کے اندر چلا جانا پڑا۔ حال میں مذہبی سورشس نے عجیب رنگ اختیار کر لیا تھا اور اس کا قلع قمع نہایت شقاوت اور بیرحمی کے ساتھ کیا گیا۔ فروری ۱۹۳۱ء میں اٹھائیس درویشوں کو منیمن میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ پھانسی کے قبل ان سب کو ایک ایک سفید لمبے پیرہن میں ملبوس کیا گیا اور ان کے سینوں پر تختیاں آویزاں کی گئیں جنپر لکھا ہوا تھا "مصطفےٰ کمال پاشا کے جمہوری عہد کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو اس طرح سزا دیجاتی ہے (قسطنطنیہ ۱۳ر فروری ۱۹۳۱ء)۔ ان درویشوں میں سے ایک درویش حسین نامی عین پھانسی کے وقت دلیرانہ طور پر سپاہیوں کی صف کو چیرتا ہوا بھاگ گیا۔ لیکن دو ہفتہ

کے بعد سردی اور بھوک سے لاچار ہو کر ایک چھوٹے سے گاؤں میں داخل ہوا۔ اہل دیہہ نے پہچان لیا کہ وہ مفرور درویش ہے۔ اور اس کو پولس کے حوالہ کر دیا جو اس کو تنہیں لے گئے تاکہ اس بدقسمت کو پھانسی دیدیجائے۔ درویشوں کے متعلق حکومت کا خیال تھا کہ ۱۹۲۵ء کی بغاوت کردستان انہیں کے سبب وقوع میں آئی تھی۔ اس لئے ستمبر ۱۹۲۵ء میں درویشوں کی خانقاہیں بند کر دی گئیں اور ان کی املاک بھی ضبط کر لی گئی + یہاں صدر جمہوریت یا مجلس وطنی کے مظالم بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ اس نظریہ کی توضیح منظور ہے۔ کہ ترکی میں جمہوریت کی شکل میں دراصل ایک مختار مطلق یعنی صدر جمہوریت حکمران ہے اور ابھی تک عوام الناس میں پوری طرح وہ خیالات مقبول نہیں ہوئے جن کے پھیلانے میں مصطفے کمال اور اس کے معاونین کوشاں ہیں + درویشوں کی آویزاں تختیوں پر جو الفاظ درج تھے وہ بہت پرمعنی تھے اور ان سے اس نظریہ کی مزید تائید ہوتی ہے۔ درویشوں کو اس لئے دار پر نہیں لٹکایا گیا تھا کہ انہوں نے

قوم کی غداری کی یا ملک کی بغاوت میں حصہ لیا بلکہ اس لیئے
کہ انہوں نے مصطفےٰ کمال کے عہد جمہوری کے خلاف بغاوت
کی۔ حکومت کے خلاف بغاوت کا الزام عائد کر دینا ہی کافی
تھا۔ لیکن مصطفےٰ کمال کا نام لانے سے صاف ظاہر ہوتا ہے
کہ حکومت کا انحصار ایک مختار مطلق پر ہے۔

اس خیال کی تائید میں اور کئی مثالیں موجود ہیں۔
مصطفےٰ کمال سمرنا میں ۱۹۲۲ء میں مقیم تھا اور وہاں اس کی ملاقات
ایک حسین۔ نوجوان۔ دولت مند۔ اور تعلیم یافتہ لڑکی لطیفہ خانم سے ہوئی
جو یورپ کی معاشرت سے بخوبی واقف تھی۔ مصطفیٰ کمال کا عقد لطیفہ خانم سے
جلد ہی ہو گیا۔ لطیفہ خانم نے اپنا اثر ملک کی فلاح وبہبود
کے لیئے ڈالنا شروع کیا۔ لیکن لطیفہ خانم ابھی دلہن ہی تھی کہ
اس کو طلاق دیدیا گیا۔ جس کی کوئی وجہ ظاہر نہیں کی گئی۔
عام خیال تھا کہ مصطفیٰ کمال لطیفہ خانم کی دخل اندازی سے
پریشان ہو گیا تھا اور وہ کسی اور شخصیت کو اپنی مطلق العنانی میں
میں شریک بنانے کے لیئے تیار نہ تھا۔ مصطفےٰ کمال نے مدت

تک اپنے اس فعل کی وجہ نہ بتائی اگر کہا بھی تو وہی جو عام طور پر خیال کیا جاتا تھا۔ حال میں مصطفیٰ کمال نے ایک ترکی اخبار کو اپنا بیان اس طرح دیا" لطیفہ خانم نے مجھے بہت نقصان پہنچایا لطیفہ خانم کی روش ایسی ہو گئی تھی کہ میں کسی طرح برداشت نہ کر سکتا تھا۔ وہ میرے جملہ اختیارات میں حصہ لینا چاہتی تھی۔ میرے خیالات پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ میرا پروگرام بدل ڈالنا چاہتی تھی۔ قدامت پرستی کا اس کے دل میں مسکن تھا۔ وہ ترکی جمہوریت کی تاجدار ملکہ بننا چاہتی تھی۔ اس کی خود پسندی خود اپنے شوہر کے آگے جھکنے سے بھی انکار کرتی تھی"۔ اس وقت تک لطیفہ خانم نے بھی اپنے لبوں پر مہر سکوت لگا رکھی تھی لیکن اس کے جواب میں اس نے یہ شائع کیا" میری بدنصیبی بہت ہی بڑی ہے لیکن میں صبر کروں گی۔ آج میں جوزیفائن کی جگہ پر کھڑی ہوں۔ ہم دونوں بدقسمت عورتیں اس لیے پیدا ہوئی تھیں کہ دنیا کے دو سب سے بڑے سپہ سالاروں کے دل فتح کریں اور پھر چشم زدن میں ثریا سے تحت الثری

میں گرا دی جائیں + میں کمال کی ملکہ تھی اور جوزیفائن ۔
نپولین کی ملکہ تھی ۔ میں نا امید نہیں ہوں ، فرانس کا مرد میدان اگر
جوزیفائن کے لیئے آخری لمحہ تک کڑھتا رہا ۔ تو مجھے یقین ہے
کہ ترکی کا مرد میدان بھی لطیفہ کے لیئے بیقرار رہے گا ۔ کیونکہ
خدا نے جوزیفائن اور لطیفہ کی قسمت یکساں بنائی ہے"

" آہ میری بربادی ! لطیفہ اور جوزیفائن کی تقدیریں
کس طرح باہم ملتی جلتی ہیں ۔ ہماری زندگیاں پاک محبت سے
شروع ہوئی تھیں اور بے گناہ قتل پر ختم ہو گئیں + جس طرح
جوزیفائن بے خطا تھی اسی طرح لطیفہ بھی بے خطا ہے + میں
اپنے جلیل القدر شوہر کے ساتھ ویسی ہی وفادار رہی جیسی کہ
جوزیفائن اپنے شوہر نپولین کے ساتھ ۔ لیکن نہیں میرا ایک
قصور ہے ۔ میں بیشک مجرم ہوں ۔ میرا جرم کیا ہے ؟ آج پہلی مرتبہ
دنیا کو اپنے جرم سے آگاہ کرتی ہوں ۔ میرا جرم ٹھیک
وہی ہے جو غریب جوزیفائن کا جرم تھا ۔ میرا گناہ میرے
شوہر کی نظر میں یہ تھا کہ میں بانجھ تھی ۔ میں اولاد پیدا نہ کر سکی ۔ ترکی

کی آبادی میں اضافہ نہ کر سکی"۔ جب اس بیان کے متعلق مصطفیٰ کمال کے خیالات دریافت کیے گئے تو ایک ترکی اخبار کا نامہ نگار لکھتا ہے کہ لطیفہ کے بیان سننے کے بعد غازی کا جواب یہ تھا کہ اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے اور زبان سے ایک حرف بھی نہ نکل سکا۔ ان بیانات کے درج کرنے سے یہ مدعا نہیں کہ مصطفٰے کمال کو دروغ گو یا پیمان شکن بتایا جائے۔ بلکہ اس کے اپنے بیان سے اس کی ذہنیت کا صاف پتہ چلتا ہے۔ جس کے متعلق ابھی لکھا جا چکا ہے۔ خواہ سیاسی معاملات ہوں یا خانگی۔ مصطفیٰ کمال درحقیقت ایک مختار مطلق ہے خواہ اس کو صدر جمہوریت کے نام سے تعبیر کیا جائے یا کسی اور سے۔ یہ کہنا بھی مقصود نہیں کہ ایک مختار مطلق اپنے ملک کو ترقی کی شاہراہ پر نہیں چلا سکتا بلکہ بسا اوقات جس قدر وہ کامیاب بن سکتا ہے اور کوئی حکومت شاید اس قدر فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ یہاں محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہر چند ترکی میں جمہوریت قائم ہو گئی ہے لیکن تاحال عوام الناس

کی ذہنیت اس طرز حکومت سے مانوس نہیں ہوئی۔ اگرچہ رفتہ رفتہ تعلیم کے ساتھ ان خیالات کے عام ہو جانے کی بھی امید ہے اور جب تک عام ذہنیت جمہوریت سے مانوس نہ ہو جائے گی اس وقت تک اس طرز حکومت کے مستقبل کو شبہہ کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ ترکی میں صدیوں شخصی حکومت کا دور دورہ رہا۔ چنانچہ اس کا اثر اب تک لوگوں کے دماغوں سے محو نہیں ہوا لیکن اگر موجودہ روش کی رفتار یہی رہی۔ تو جلد ممکن ہے کہ عام ذہنیت میں تبدیلی ہو جائے۔ ابھی حال میں مصطفے کمال نے جدید عام انتخاب کا اعلان کیا اور اس کا مقصد تھا کہ ترکی میں مطلق العنانی کا دور ختم ہو جائے۔ لیکن انتخاب کا نتیجہ مایوس کن رہا اور موجودہ خیالات کے افراد پھر بیشتر منتخب ہوئے جس سے صاف ظاہر ہے کہ ابھی عام ذہنیت میں فرق پیدا نہیں ہوا اور مصطفی کمال کی کوشش کہ مجلس وطنی میں ایک اور آزاد اور رائے فریق پیدا ہو جائے۔ بار آور ثابت نہیں ہوئی ان واقعات کی وجہ سے جو اوپر بیان کئے جا چکے ہیں مخالف

جماعت کو مدد ملتی رہی - اور ان کی ایک باقاعدہ "ترقی پسند" جماعت بن گئی ہے جس میں کئی مشہور اور قابل اشخاص شامل ہیں مثلاً رؤف بے جو پہلے مصطفےٰ کمال کا ایک بڑا معاون تھا اور وزیر اعظم بھی رہ چکا ہے + رفعت پاشا جو وزیر اعظم رہ چکا ہے اور جس نے سلطان کو معزول کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا اور ڈاکٹر عدنان بے و کاظم بکر پاشا وغیرہ +
"جمہوریت پسند" جماعت سے جو برسر اقتدار تھی افراد نکل کر نئی مخالف جماعت میں شامل ہونے لگی اور اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ فتحی بے جس کی ہمدردی "ترقی پسند" جماعت کے ساتھ تھی ۱۹۲۴ء میں وزیر اعظم ہو گیا + فروری ۱۹۲۵ء میں کردستان کی بغاوت شروع ہو گئی اور فتحی بے پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے سختی کے ساتھ بغاوت کو فرو کرنے کی کوشش نہیں کی + چنانچہ فتحی بے وزارت سے مستعفی ہو گیا اور عصمت پاشا اس کے بجائے وزیر اعظم مقرر ہوا + مخالف اخبارات پر جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے - ہر طرح کا دباؤ ڈالا گیا اور ان کی

اثر کو زائل کیا گیا۔ فتحی بے تھوڑے عرصہ بعد فرانس بطور سفیر روانہ کر دیا گیا۔ چنانچہ اس شورش کے خاتمہ پر مصطفےٰ کمال بدستور معہ پرانے اقتدار کے صدر حکومت رہا اور عصمت پاشا اس کا نائب برقرار رہا۔

عثمانیہ بادشاہت کا خاتمہ یکم نومبر ۱۹۲۲ء کو ہوا۔ اور ایک سال گذرنے پر ترکی جمہوریت کا اعلان کیا گیا۔ لیکن نئی طرز حکومت کے آئین کا اعلان ۲۰ راپریل ۱۹۲۴ء کو کیا گیا۔ یکم مارچ ۱۹۲۴ء کو مصطفیٰ کمال نے مجلس وطنی کے پانچویں سالانہ افتتاحی جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

(۱) قوم کا متفقہ مطالبہ ہے کہ ترکی جمہوریت کو ہر صورت میں قائم رکھا جائے۔ (۲) عام تعلیم کو یکساں ایک ہی سلسلہ کے ماتحت رکھا جائے جس کا انتظام وکیل تعلیم یعنی وزیر تعلیم کے سپرد ہو۔ اس طرح محض مذہبی مدارس کا خاتمہ ہو گیا۔ (۳) اسی طرح جملہ عدالتی نظام کو وکیل عدل کے سپرد کر دیا جائے اور مذہبی اور دیوانی عدالتوں کا امتیاز اٹھا دیا جائے

فوج کو سیاسی معاملات میں دخل اندازی کا موقع نہ دیا جائے جس کے یہ معنی تھے کہ فوج افسران مجلس وطنی میں منتخب نہ ہو سکتے تھے + (۵) مذہب کو سیاسی معاملات سے غیر متعلق رکھا ئے جس کے معنی تھے کہ وکیل امور مذہبی جو پہلے شیخ الاسلام کہلاتا تھا کابینہ کا ممبر نہ ہو سکتا تھا + انہیں اہم اصولوں کی بناپر آئین بنایا گیا۔ اور اپریل میں اس کا بھی اعلان کر دیا گیا +

آئین کی پہلی شرط ترکی حکومت کا جمہوریت ہونا قرار دیا گیا اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم قانوناً ممنوع کر دی گئی + ملک کی حکومت ایک انتخاب شدہ ایوان کے لئے مخصوص کر دی گئی۔ جو "مجلس وطنی" کے نام سے مشہور ہے + "مجلس وطنی کو مکمل اختیارات عاملانہ۔ عدالتی اور قانون سازی کے دیدیئے گئے ہیں چنانچہ سلطان کی جگہ اب مجلس وطنی کو سمجھنا چاہیئے۔ مجلس وطنی۔ وضع قوانین براہ راست خود اپنے ایوان کے ذریعہ کرتی ہے + اندیشہ تھا کہ کہیں مجلس وطنی۔ فوجی جماعت

نہ پہنچا سکے اس لیئے فوجی افسران کو مجلس میں بحیثیت رکن منتخب
ہو کر شرکت کرنے سے قانوناً منع کر دیا گیا، اس شرط کی وجہ
سے متعدد افسران نے جو انقلاب میں مصطفےٰ کمال کے شریک
رہے تھے اپنے فوجی عہدوں سے استعفا دیدیا ہے تاکہ
مجلس وطنی میں داخل ہوسکیں + ناظم فوج کو کابینہ میں داخل نہیں
کیا گیا اور اس طرح حکومت کو فوجی اثر سے بالکل پاک رکھا
گیا ہے + اس امر میں نہایت دوراندیشی سے کام لیا گیا ہے اور
غالباً کراموپل وغیرہ کی فوجی حکومتوں کی ناکامیاب مثالوں
سے فائدہ اٹھایا گیا ہے مجلس وطنی صدر جمہوریت کو منتخب
کرتی ہے اور اس کی وساطت سے عاملانہ اختیارات پر
پر نگہداشت کرتی ہے + صدر جمہوریت کابینہ کے صدر کو مقرر
کرتا ہے اور وہ صدر اپنے کابینہ کے ممبروں کا تقرر کرتا ہے +
مجلس حکومت کے احکامات پر نگرانی رکھتی ہے اور اس سے
اختیارات واپس لینے کی مجاز ہے + کابینہ کے ممبران جن
کو مکمل عاملانہ اختیارات حاصل ہیں مجموعی اور انفرادی حیثیت

سے حکومت کے افعال اور روش کے لیئے مجلس کو جوابدہ
ہیں + صدر کا انتخاب چار سال کے لیئے ہوتا ہے اور اس
حیثیت سے وہ رسمی موقعوں پر مجلس کے اجلاس میں بحیثیت
صدر کام کرتا ہے اور ہر سال نومبر کے مہینہ میں ایک افتتاحی
خطبہ پڑھتا ہے جس میں آیندہ سال کے متعلق حکومت کی روش
کا اظہار کرتا ہے + ضرورت کے وقت وہ عاملانہ مجلس یعنے
کابینہ کے اجلاس میں بھی بحیثیت صدر شرکت کرتا ہے +

جمہوریہ ترکی اور روس کے سویٹ جمہوریت کے
مابین متعدد دفعہ گفت وشنید ہوئی ہے اس لیئے عام خیال
پیدا ہو گیا ہے کہ ترکی بھی روس کے قدم بقدم ایک لامذہب
اور اشتراکی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے لیکن ان دو حکومتوں
میں کئی اصولی اختلافات ہیں + ترکی جمہوریت نے اگرچہ اسلامی
معاشرت کی کئی دیرینہ خصوصیات کو خیرباد کہدیا ہے
لیکن ان کے آئین کی دفعہ دو کی رو سے ترکی حکومت مذہب ا
سلام پر مبنی ہے ۔ حالانکہ سویٹ حکومت کا تمام تر انحصار ۔

کارل مارکس کے اصولوں پر ہے ۔ ترکی میں قوانین کی اصلاح کے لیے ایک کمیشن مقرر ہوا تھا اس کے ایک غیر مسلم ممبر نے دوران مباحثہ میں اس امر پر بہت زور دیا کہ کمیشن کو محض یورپ کے قوانین کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور اس لئے اسلامی شریعت کا لحاظ نہ رکھا جائے لیکن اس تحریک کو اس بنا پر نظر انداز کر دیا گیا کہ ترکی میں بیشتر افراد مسلمان ہیں اس لئے اسلامی شریعت کا ضرور لحاظ رکھا جائے۔ تاکہ مجوزہ قوانین عام طور پر مقبول ہو سکیں ۔ علاوہ ازیں اسلامی شریعت کی رو سے افراد اپنی ذاتی حیثیت سے ملکیت قائم رکھ سکتے ہیں اور انفرادی آزادی ہر فرد کا حق تصور کی گئی چونکہ خدا نے ہر شخص کو اپنے فرائض ادا کرنے کے لئے عطا کی ہے۔ چنانچہ ترکی آئین کی دفعات ۷۰۔ ۷۱۔ اور ۷۴ میں ان خیالات کا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ حالانکہ سوویٹ حکومت کے نزدیک اور کارل مارکس کے خیالات کے مطابق انفرادی حیثیت سے شخصی حقوق یا ملکیت بے معنی ہیں۔ اسی طرح برٹلی

تعلقات میں بھی ترکی کو سویٹ سے اختلاف ہے بلکہ اس
لحاظ سے یورپ کی تقلید نمایاں ہے۔ محمود اسد بے وکیل عدل
نے ۱۹۲۶ء کے شروع میں تعزیرات کا ایک نیا مجموعہ جو اٹلی
کے قانون سے مشابہت رکھتا ہے۔ اور جس میں سات سو
دفعات ہیں مجلس کے سامنے پیش کیا اس طرح ضابطہ دیوانی
جس میں اٹھارہ سو دفعات ہیں سوئٹزرلینڈ کے ضابطہ کو ملحوظ
رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اور قانون تجارت جس میں سات سو
دفعات ہیں بیشتر جرمنی کے قانون پر وضع کیا گیا ہے۔ اس
سے ایک دو ماہ قبل مصطفی کمال نے انگورہ میں قانونی تعلیم
کے لئے ایک درسگاہ قائم کی جس میں وکلا، اور عدالتی حکام
تعلیم پایا کرینگے۔ یہ سب اس غرض سے کیا گیا ہے کہ تعلیم
اور سیاسی اصلاح ساتھ ساتھ فروغ پاسکیں۔ ترکی میں آجکل
چھ سو عدالتیں قائم ہیں جن میں سے ایک سو ساٹھ مواضعات
میں ہیں اور بقیہ قصبوں اور شہروں میں۔ یہ وہ عدالتیں ہیں
جن میں دیوانی فوجداری اور تجارتی مقدمات ابتدائی منزل

میں پیش ہوتے ہیں + اس کے اوپر ایک عدالت اعلیٰ ہے جس کے بتیس ممبر ہیں جو مختلف قسم کے مقدمات کے لئے مختلف فرقوں میں منقسم ہیں + یہ عدالت ۔ ماتحت عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں سنتی ہے + پہلے یہ عدالت عسکی شہر میں متعین تھی لیکن اب انگورہ میں اس کو جگہ دیدی گئی ہے ۔ عدالتوں کی کارروائیو کی نگرانی کے لئے ۔ ملک کو چھ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے ۔ ہر حصہ کے انسپکٹر اپنے اپنے حلقوں میں گشت کرتے ہیں تاکہ بے ضابطہ کارروائیاں عمل میں نہ آئیں +

باب پندرہ

اندرونی ترقی

سیاسی انقلاب سے محض طرز حکومت کو بدل دینا ایک ملک کی بہبودی کے لئے کافی نہیں انقلاب کے اثرات اسی وقت دیرپا ہو سکتے ہیں۔ جب ملک کی اندرونی حالت کو بھی درست کیا جائے + ترکی نے طرز حکومت کے بدلتے ہی اندرونی حالات کیطرف توجہ کی اور اپنا اولین مقصد ملک کو اقتصادی حیثیت سے آزاد بنانا ٹھرایا + گذشتہ دس سال کی متواتر جنگ آزمائیوں کے باعث ترکی کی آبادی میں بہت تخفیف ہو گئی تھی + جنگ عظیم کے بعد متواتر صوبجات الگ ہوتے گئے بدیں وجہ مردم شماری میں اور بھی کمی ہو گئی۔ تجارتی کاروبار میں سرمایہ کی قلت بشدت محسوس کی جا رہی تھی + اور

اگرچہ جمہوریت کے قبضہ میں شاہی محلات کوٹنک یلدز اور دولمہ باغچہ وغیرہ کہ جن کی ثروت اور دولت کا غلغلہ عام تھا ۔ آچکے تھے لیکن دراصل وہاں اب کچھ بھی نہ تھا + خزانہ خالی پڑا تھا اور قرضہ جات عامہ کی رقم ایک کثیر تعداد تک پہونچ چکی تھی + بیشتر ذرائع آمدنی کم حیثیت اور ناکارہ ہو چکے تھے مسلسل جنگ میں مشغولیت کے باعث ذکور آبادی ملک کی ضروریات کے لیئے بہ مشکل کافی تھی + مویشیوں کی تعداد میں روز بروز انحطاط ہوتا رہا تھا ۔ اس لیئے زراعت بھی کہ جو ترکی کے لیئے ایک مستقل ذریعہ آمدنی ہے تباہ حال تھی ۔ باوجود ان صبر آزما حالات کے جمہوریہ ترکی بیرونی تباہ کن اثرات سے محفوظ رہنا چاہتی تھی ۔ اقتصادی غلامی کی تلخ کامیاں ابھی تازہ تھیں ۔ اس لیئے جمہوریہ ممالک بیرونجات سے کسی قسم کی امداد نہیں لینا چاہتی تھی ۔ یہی وجہ تھی کہ انعقاد جمہوریہ کے بعد ایک عرصہ تک ملک کی اقتصادی حالت میں ابتری کے آثار نمایاں رہے +

لوزان کانفرنس کی شرائط کے مطابق ترکی اور یونان میں تبادلہ آبادی قرار پایا تھا ترکی نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے نہایت جانفشانی سے کام شروع کر دیا + یونان اور ترکی کی ایک مشترکہ کمیٹی مقرر کر دی گئی تاکہ تبادلہ آبادی میں ایک دوسرے کو جس قدر آسانیاں ممکن ہوسکیں بہم پہنچائیں + ہر چند کہ نہایت وسیع انتظامات کئے گئے تھے لیکن تاہم مہاجرین کی حالت اس قدر زار تھی کہ دیکھنے والوں کے دل بھر آتے تھے + یہ لوگ افلاس کی حالت میں بے خانماں کر دیئے گئے تھے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ پہاڑی باشندوں کو دیس میں جگہیں ملیں اور دیس کے رہنے والوں کو پہاڑی علاقوں میں مقیم کیا گیا +" اموال متروکہ" یعنی یونانی آبادی کے مکانات وغیرہ جو خالی ہوئے تھے ان کو محض مہاجرین کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی کئی جگہ مقامی ترکوں نے انہیں سے اچھے مکانوں پر قبضہ کر لیا تھا + تاہم تبادلہ آبادی کافی سرعت اور کامیابی کے ساتھ

وقوع میں آیا + یونان کو بین الاقوامی جماعت سے بہت مدد ملی لیکن ترکی کو خود اپنے وسائل پر اکتفا کرنا پڑا + اس میں شک نہیں کہ ترکی جمہوریہ کو اس تبادلہ میں متعدد مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن بالآخر ترکی میں ایک قومیت قائم ہو گئی +

یہ ترک جو یونان سے آئے تھے اکثر تجارتی اور زراعتی فنون میں دسترس رکھتے تھے اور اس طرح سے ترکی کی خدمت کرنے کے لئے موزوں تھے + ترکی کا موجودہ رقبہ تقریباً دو لاکھ دس ہزار مربع میل ہے اور اس کی آبادی کم و بیش ڈیڑھ کروڑ ہے چنانچہ فی مربع میل ستر نفوس کے قریب آبادی کی اوسط نکلتی ہے جو انگلستان اور دیگر ممالک یعنی فرانس جرمنی وغیرہ کے مقابلہ میں نہایت ہی کم معلوم ہوتی ہے + لیکن ترکی دراصل زراعتی ملک ہے اور اس لحاظ سے یہ اوسط آبادی کم نہیں مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ اور مصر میں اوسط صرف اکتیس ۳۱ ہے +

ترکی میں باقاعدہ مردم شماری اکتوبر ۱۹۲۷ء میں

کی گئی تھی + یوم جمعہ ۲۸ اکتوبر۔ مردم شماری کا آخری دن مقرر ہوا۔ اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ جبتک اطلاعی توپ نہ چلائی جائے کہ جس سے مردم شماری کی تکمیل کا اعلان مقصود ہوگا کوئی شخص اپنے مسکن سے باہر نہ آئے۔ سرکاری اہلکاروں نے مکان پر جا کر مردم شماری کے کاغذات کی خانہ پُری کی۔ جن سے نام ولدیت۔ تاریخ پیدائش اور لکھنے پڑھنے کی قابلیت ظاہر ہوتی تھی + اس مردم شماری میں ملک کی مجموعی آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ نکلی + اُسپر اکثر جگہ تعجب اور شبہہ کیا گیا لیکن بلجیم کے ایک ماہر مردم شماری افسر نے جو انتظامات شمار پر خاص طور پر متعین کیا گیا تھا + اس تعداد کی تصدیق کی +

ترکی میں زراعت پُرانے طریقہ پر ہوتی ہے اور وہاں زراعتی ترقی کے لئے انہیں اصلاحات کی ضرورت ہے جو ہندوستان میں درکار ہیں + حکومت کو اس ضرورت کا احساس قوی ہے اور کوششیں کی جا رہی ہیں کہ مغربی اصول پر زراعت کی جائے + ملک کے مختلف حصوں

میں آٹھ زرعتی اسکول قائم کئے گئے ہیں جہاں تعلیم کے علاوہ
جدید اختراعات کے تجربے کئے جاتے ہیں۔ تاکہ عام طور
پران جدید معلومات سے کاشتکار مستفید ہوسکیں + مصطفےٰ کمال
نے خود انگورہ کے قریب زراعت شروع کردی ہے تاکہ
عوام کو اسکی طرف ترغیب ہو اور کاشتکاروں کے کے لئے
ایک نمونہ پیش کیا جاسکے + اناطولیہ کے مغربی حصہ میں
بالخصوص بہت دلچسپی لی جارہی ہے اور متواتر کلوں اور
مشینوں کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ دخانی ہل اور غلّہ
کاٹنے کی مشین جو پہلے شاذ نظر آتی تھیں اب عام طور پر اؔدانہ
اور سمرنا۔ اور بروسہ کے قرب و جوار میں دکھائی دیتی ہیں۔
ترکی چند اشیار مثلاً روئی۔ انجیریں۔ اون وغیرہ کی پیداوار
کے لئے قدرتی طور پر موزوں ہے + حال میں ان اشیار
کی پیداوار میں نمایاں ترقی ہوگئی ہے لیکن یہ پیداوار جتبک
باآسانی اضلاع منصلہ وغیر ممالک میں نہ جاسکے گی۔ ترکی کو
زیادہ منافع نہیں ہوسکتا اور اس کے لئے ضرورت ہے کہ

ریلوں کا سلسلہ تمام ملک میں پھیلا دیا جائے +

ترکی حدود اب بھی کافی وسیع ہیں اور آبادی مختلف جگہوں پر منتشر ہے۔ اس لئے جب تک ان دور دراز کے مقامات کو ریل سے نہ ملا دیا جائے گا۔ زراعت تا تجارت کو ترقی نہیں ہو سکتی + حکومت اس طرف بھی متوجہ ہو چکی ہے اور ریلوے لائینوں کی تعمیر میں مصروف ہو + چونکہ باشندوں کے پاس نہ اس قدر سرمایہ تھا نہ ان کو کوئی گذشتہ تجربہ تھا اس لئے جدید ریلوے لائینوں کی تعمیر غیر ملکی اشخاص ہی کے سپرد کی گئی۔ چند بہترین لائینیں جو زراعتی علاقوں سے گذرتی ہیں تعمیر ہو چکی ہیں، اور ان کا سلسلہ قسطنطنیہ تک پھیلا دیا جا چکا ہے جمہوریت کا منشا ریلوے لائینوں کے پھیلانے سے محض اقتصادی ہی نہیں ہے بلکہ ان کے ذریعہ سے ملک کی حفاظت بھی مدنظر ہے + اس لئے اب ملکی سرمایہ سے ترکی انجنیر روز بروز زیادہ تعداد میں ریلوں کی تعمیر پر کام کر رہے ہیں۔ فوجوں کی نقل و حرکت میں بھی آسانی اسی وقت ہو سکتی ہے کہ جب ملک میں ریلوں

کا سلسلہ موجود ہو۔ اور بر وقت ضرورت۔ بسرعت تمام افواج حسب منشاء حکومت۔ مدافعانہ اور جارحانہ کارروائی کے لیئے ملک کے مختلف حصوں میں پہنچ سکیں + کردستان کی بغاوت نے جو ۱۹۲۵ء کے اوائل میں برپا ہوئی۔ اس ضرورت کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا + چنانچہ اس خیال کو پیش نظر رکھ کر سمسوں۔ سیواس ریلوے تعمیر کی گئی ہے جو بحیرہ اسود تک جاتی ہے + انگورہ سیواس لائن بھی اسی لیئے بنائی گئی ہو ان دونوں لائنوں کو بمقام سیواس ملا دیا گیا ہے +

زراعت ایک ملک کے لیئے لازمی ہے اور ہر چند اس کے فوائد ایسے نہیں کہ نظر انداز کیئے جا سکیں لیکن فی زمانہ تمام ترقی یافتہ اور متمول ممالک نے تجارت کو اپنی نشو و نما کے لیئے ضروری سمجھا ہے + تجارت کے ساتھ صنعت و حرفت کی طرف توجہ کرنا بھی لازمی ہے + ترکی میں یہ سب شعبے کم و بیش بیرونی تاجروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھ میں تھے جس کے باعث بیرونی اقتدار نے ملک پر سکہ جما رکھا

تھا۔ لوزان کانفرنس میں ترکی کو اس بیرونی اقتدار سے نجات مل چکی تھی اور اب وہ دوبارہ اپنی پہلی غلطی کو دہرانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر ملک میں سرمایہ نہیں تھا اور نہ ابھی باشندوں میں یہ میلان پیدا ہوا تھا کہ ان شعبوں کو اپنے ہاتھوں میں سنبھال سکیں لیکن یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ اس کمی کی وجہ سے ملک کی اقتصادی حالت میں ابتری پھیل رہی ہے اور افلاس بڑھ رہا ہے۔ جمہوریت نے اس امر کو بہتر سمجھا کہ ملکی سرمایہ ہی سے شروعات کیجائے۔ اور آیندہ کے لئے بیرونی امداد مطلقاً طلب نہ کیجائے۔ اس طرح ترکوں میں قومی آزادی کا پندار اور بھی مستحکم ہو گیا۔ ان کی جمہور طبیعت یہی چاہتی تھی کہ اپنی قوت اور اپنے سرمایہ سے ہی ملکی صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ دیا جائے۔ اس لئے جمہوریت کی جانب سے متعدد اشیاء کی ساخت کا انتظام کیا جا چکا ہے۔ اور حکومت کو ان اشیاء سے متعلق مکمل اجارہ حاصل ہے۔ نمک کا اجارہ مدتوں سے چلا آ رہا تھا۔ لیکن اس کی آمدنی ۱۸۸۱ء میں "کمیٹی قرضہ جات

عامہ کے سپرد کر دی گئی تھی۔ حال میں حکومت نے تنباکو، سگرٹ
کا کاغذ اور دیا سلائی کی ساخت کا انتظام بھی اپنے ہاتھوں
میں لے لیا ہے + عشاق کے شکر کے کارخانوں کو بھی اسی مقصد
سے مدد دی جا رہی ہے + شراب کی کشید اور اس کی فروخت
کا انتظام بھی حکومت نے ۱۹۲۵ء سے اپنے ذمہ لے لیا ہے +
کارخانوں کی ہر طرح معاونت کی جا رہی ہے + اور ان کے
قائم کرنے کے لئے کئی قسم کے ٹیکس بھی معاف کر دیئے گئے
ہیں + شکر کے علاوہ اور متعدد اشیا، مثلاً زیتون کا تیل
کاغذ۔ اور سوت وغیرہ کے کارخانوں کو حکومت برابر مدد دے
رہی ہے۔ زراعتی بنک کے اصول پر قسطنطنیہ میں صنعت و حرفت
کی ترقی کے لئے ایک مرکزی بنک قائم کر دیا گیا ہے جس کی
شاخیں ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی ہیں + ہر چند کہ ۱۹۲۵ء
کے بجٹ میں دو فی صدی سے بھی کم رقم اس مد کے لئے مخصوص
کی گئی تھی لیکن پھر بھی اس شعبہ میں نمایاں ترقی نظر آتی ہے +
جمہوریت کے آغاز پر حکومت کا صدر مقام انگورہ

قرار پایا اور قسطنطنیہ کی حیثیت دارالسلطنت کی نہ رہی۔ اس تبدیلی سے تجارت اور حرفت پر بڑا اثر پڑا۔ ترکی کی تجارت کے لئے قسطنطنیہ کی وہی حیثیت تھی جو لندن کی برطانیہ عظمی کے لئے ہے۔ بلکہ اپنی جغرافی کیفیت سے قسطنطنیہ کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے قسطنطنیہ کی اہمیت صرف تجارتی ہی نہیں ہے بلکہ سیاسی۔ مذہبی اور فوجی اعتبار سے بھی تمام دنیا میں ممتاز تر ہے۔ اسی وجہ سے ہمیشہ مختلف قومیں حریص نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی ہیں۔ جنگ عظیم کے اختتام پر قسطنطنیہ ترکی کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ لیکن لوزان کانفرنس نے پھر ترکی کو واپس دلادیا۔ سیاسی وجوہات کی بنا پر جمہوریت نے قسطنطنیہ کو ترک کر دیا اور انگورہ کو اس کی جگہ اپنا صدر مقام بنایا۔ اگرچہ یہ تبدیلی سیاسی نقطہ نظر سے ضرور مناسب تھی۔ لیکن تجارتی حالت سے ملک کو بہت نقصان پہنچا۔ صدر جمہوریت اور حکومت کی بے اعتنائی کے باعث قسطنطنیہ اپنی پرانی حالت سے بہت جلد گر گیا۔ اور

اس کی وسیع تجارت بھی کم ہو گئی + برخلاف اس کے
انگورہ جو پہلے مفصلات میں ایک معمولی مقام تھا اب روز
افزوں ترقی کر رہا ہے اور اپنی نئی عظمت کی وجہ سے بڑے
شہروں میں شمار کیا جاتا ہے + انگورہ کے الگ تھلگ ہونے
کے باعث وہاں کے افراد میں جلد ہی آزادی اور خود اعتمادی
کے احساسات موجزن ہونے لگے اور وہ زندگی کے ہر
شعبہ میں اپنی قوت ہی سے ترقی کرنے کے خواہاں ہو گئے +
قسطنطنیہ کے زوال کے ساتھ عثمانیہ قرضہ جات عامہ کی کونسل
کے اقتدار میں بھی کمی ہو گئی + یہ کونسل ۱۸۸۱ء میں قائم ہوئی
تھی اور اس کے سپرد آمدنی کے چھ ذرائع کر دیئے گئے تھے
تاکہ رفتہ رفتہ بیرونی قرضہ جات کی ادائیگی ہو جائے + ہر چند
اس بین الاقوامی کونسل کا کام قابل ستائش تھا۔ لیکن قوم پسند
ترک اس کے قیام کو کسی طرح منظور کرنے کے لئے تیار
نہ تھے + ترکی کے متعدد مقبوضات آزاد ہو چکے تھے اس لئے
قرضہ جات کی ادائیگی کی ذمہ داری میں بھی تخفیف ہونا لازمی

تھا + چنانچہ موجودہ صورت یہ ہے کہ گذشتہ قرضہ میں سے چالیس فی صدی کی ادائیگی کے لئے جمہوریت ذمہ دار ہے + ترکی کا قرضہ بیشتر سلاطین کی فضول خرچیوں سے بڑھ گیا تھا اور خاصکر عبدالمجید (۱۸۳۹ء تا ۱۸۶۱ء) اور عبدالعزیز (۱۸۶۱ء تا ۱۸۷۶ء) کے زمانہ میں قرضہ جات عامہ میں بہت اضافہ ہو گیا تھا + جنگ روس ترکی کے اختتام پر قرضہ کی رقم پچیس کروڑ پونڈ تک پہنچ گئی تھی اور ملک کی آمدنی میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوا تھا + لیکن ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۳ء تک ترکی کے مقبوضات علیحدہ ہوتے رہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس صورت میں ترکی پر تمام قرضہ کی ذمہ داری عائد نہیں ہو سکتی موجودہ زمانہ میں اگرچہ حکومت انگورہ نے قرضہ جات عامہ کی کونسل کے اختیارات سے انکار نہیں کیا لیکن عملی حالت میں کونسل بالکل بے بس ہے اور آمدنی کے جملہ ذرائع حکومت ہی کے نگرانی میں ہیں + ترکی نے ۱۹۲۳ء میں ایک معاہدہ کی رو سے وعدہ کیا تھا کہ دولت عثمانیہ کے قرضوں کا جو حصہ اسپر

عائد ہوا ہے اس کو وہ بذریعہ اقساط ادا کر دے گی۔ اور قسط کی تعداد سال بہ سال زیادہ ہوتی جائے گی۔ لیکن ابھی زیادہ مدت نہ گذرنے پائی تھی کہ ملک عام اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہو گیا اور حکومت حسب وعدہ قسط ادا کرنے کے قابل نہ رہی + لیکن حکومت یقین دلا رہی ہے کہ وہ ۱۹۲۸ء کی طرح اب بھی حسن نیت پر قائم ہے اور اس یقین کے باوجود کہ سلاطین نے یہ رقمیں ملک وملت پر نہیں صرف کی تھیں بلکہ وہ اپنی عیاشیوں اور فضول خرچیوں کے لئے قرض لیتے رہے موجودہ حکومت حسب وعدہ قرضوں کو ادا کر دینا چاہتی ہے مگر موجودہ حالات اور مستقبل کے خطرات اس کی اجازت نہیں دیتے کہ قرض ۱۹۲۸ء کی فیصلہ شدہ قسطوں میں ادا کیا جائے اور آج کل کی کساد بازاری کو مدنظر رکھتے ہوئے حسب مطالبہ ۱۸ ملین پونڈ کی رقم ادا کرنا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں + انہیں امور کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت انگورہ کی کمیٹی مالیہ نے اطلاع دی ہے کہ وہ اب کی قسط

کی ایک تہائی رقم سے زیادہ ادا نہیں کر سکتی +

ممالک مغربی کا تمول وہاں کی صنعت وحرفت ہی کا کرشمہ ہے اور بغیر اس کے ان کا گذارہ نہیں ہو سکتا + ترکی کی بھی نظریں اسی طرف جمی ہوئی ہیں۔ اور وہ برابر اس شاہ راہ پر گامزن ہو + جغرافی حالت سے ترکی کو بے شمار آسانیاں ہیں کہ وہ اپنی تجارت کو وسیع کر سکے اور اپنے کارخانوں کو فروغ دے سکے +

ترقی کے لئے امن کا قائم رکھنا لازمی ہے اور یہ ترکی کو مدت سے نصیب نہ ہوا تھا۔ لیکن اب گذشتہ چند سال سے ملک کی اندرونی حالت قابل اطمینان ہے اور بیرونی مداخلت کا بھی اندیشہ نہیں + علاوہ ازیں ملکی کارخانوں کو اسی وقت ہی فروغ ہو سکتا ہے کہ جب اس کے لئے تین ضروری اسباب یعنی۔ سرمایہ۔ مزدور۔ حرفتی قابلیت موجود ہوں + ترکی میں سرمایہ کی کمی ہے لیکن بیرونی مدد سے جمہوریت کو اجتناب ہے اس لئے رفتہ رفتہ ملک ہی کا سرمایہ

لگایا جارہا ہے۔ متواتر جنگ کے باعث آدمیوں کی بھی قلت ہوگئی تھی لیکن اب مستورات زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کے ساتھ دوش بدوش کام کررہی ہیں۔ اور اس طرح یہ کمی بھی کسی حد تک پوری ہوگئی ہے۔

حرفتی قابلیت کے لئے ضروری ہے کہ حرفتی تعلیم دیجائے۔ چنانچہ ترکی میں متعدد زراعتی اور دیگر حرفتی مدارس کھل گئے ہیں اور ان میں طلبا، روزبروز زیادہ تعداد میں داخل ہورہے ہیں۔ اگرچہ ان تینوں ضروری اسباب کی قلت کی وجہ سے ترکی میں دفعتاً نمایاں ترقی نہیں ہوسکتی لیکن بالآخر مذکورہ بالا لائحہ عمل ہی ترکی کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ کیونکہ جب ان شعبوں میں کامل نشوونما ہو جائے گی تو جملہ آمدنی اور منافع ترکوں ہی کا ہوگا۔ اور اس میں سے کوئی جزو بیرونی ممالک میں نہ جائیگا۔ اسی خیال کو مدنظر رکھ کر جمہوریت نے اس طرز عمل کو اختیار کیا تھا اور اس کا یہ بھی مقصد تھا کہ غیر ملکی سرمایہ کی وجہ سے

خارجی اقتدار دوبارہ نہ جم سکے۔

ترکی نے اپنا تجارتی بیڑہ بھی اپنی ضروریات کے موافق بنا لیا ہے۔ بیڑہ کی مجموعی طاقت ۱۹۳۰ء کے آخر میں دو سو ستر جہازوں پر مشتمل تھی۔ جن میں سے ستاون جہاز سواری کے کام آتے ہیں اور ان کا مجموعی وزن (۸۳۴۷۹) ٹن ہے۔ پچپن جہاز اسباب تجارت کے نقل وحمل کے لئے مخصوص ہیں ان کا مجموعی وزن (۵۲۲۰۷) ٹن ہے۔ چھپن جہاز قرب وجوار کے سواحل میں نقل وحمل کے کام آتے ہیں۔ اور ان کا مجموعی وزن (۲۱۷۷۰) ٹن ہے۔ علاوہ ازیں بائیس جہاز دیگر متعلقہ کام کے لئے ہیں۔ چھ جہاز خراب شدہ اور پھنسے ہوئے جہازوں کی امداد کے لئے ہیں اور نو جہاز ہمیشہ خلیج استنبول میں موجود رہتے ہیں۔ جہازوں کی تعداد سے ظاہر ہوگا کہ موجودہ حالت میں ترکی کی تجارت کے لئے جہازوں کی یہ تعداد کم نہیں ہے۔ اس شعبہ میں بھی بمانند دیگر شعبوں کے جمہوریت بالکل خودمختار رہنا چاہتی ہے

اور اسی لئے یہ قانون نافذ کر چکی ہے کہ ترکی جہازوں پر غیر ترکی افراد کام نہیں کر سکتے + اس سلسلہ میں۔ سر ٹیلفورڈ واہ نے اپنی تازہ تصنیف "ترکی دیروز۔ امروز، فردا" میں ایک دلچسپ واقعہ درج کیا ہے + سر ٹیلفورڈ والے نے ترکی عدالتوں کی تعریف کی ہو اور تحریر کیا ہے کہ اگرچہ غیر ملکی مراعات کا خاتمہ ہو گیا ہے لیکن تاہم ترکی عدالتیں کمال انصاف کے ساتھ کام کر رہی ہیں مگر کبھی کبھی عجیب قانونی دقتیں پیش آتی ہیں جیسا کہ حسب ذیل مثال سے ظاہر ہے + ساحلی تجارت کرنے والے جہازوں کو ممانعت ہے کہ کسی غیر ترک رعایا کو ملازم نہ رکھیں ورنہ بصورت حکم عدولی ان کو گرفتار کر لیا جائیگا + ترکی جہاز "کپلان" کو ایک برطانی بندرگاہ سے گذرنے کی اجازت نہ دیگی کیونکہ اس میں لاسلکی تار موجود نہ تھا + جہاز کے کپتان نے فوراً لاسلکی تار لگوا لیا لیکن چونکہ اس جہاز کے ملازمین میں سے کوئی تار کا کام نہ جانتا تھا اس لیئے کپتان کو ایک نوکر انگریز رکھنا پڑا + اس لاسلکی انجنیر مسمی ولیم نے قسطنطنیہ کے سفر کے لئے معاہدہ ملازمت لکھدیا۔ لیکن قسطنطنیہ پہنچ

پر وہ گرفتار کر لیا گیا کیونکہ نئے قانون کی خلاف ورزی کی گئی تھی۔ بہرحال کپتان نے اپنی ضمانت پر ولیم کو رہا کرالیا اور مقدمہ کے دوران میں ولیم کو اپنے گھر پر رکھا۔ ایک ترک وکیل نے صفائی کی جانب سے پیروی کی اور ملزم کو اس بنا پر جرم سے بری کرالیا کہ جس وقت جہاز قسطنطنیہ کے بندرگاہ میں پہونچا تھا ولیم اپنا کام ختم کر چکا تھا اور اس کو جہاز سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔

الغرض جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ موجودہ حکومت نے اپنا اہم ترین مدعا یہ بنا رکھا ہے کہ جملہ صیغوں میں ملکی افراد اور ملکی سرمایہ ہی کے توسل سے ترقی کی جائے۔ اور اس مقصد میں انہیں بتدریج کامیابی ہو رہی ہے۔

باب سولہ

تمدن و معاشرت

گذشتہ انقلاب نے ترکی میں طرز حکومت ہی کو نہیں
بدلا بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک اہم اور نمایاں تبدیلی پیدا
کر دی ہے۔ ملک کے تمدن اور معاشرت میں اس قدر سرعت
کے ساتھ انقلاب وقوع میں آیا ہے کہ دنیا محو حیرت ہے اور اس
تیز گامی کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہے لیکن یہ معاشرتی انقلاب
جو اب نمایاں ہوا ہے دراصل نوجوان ترکوں کی تحریک کے
زمانہ سے رفتہ رفتہ رونما ہو رہا تھا۔ اس سلسلہ میں متواتر ۱۹۰۸ء
سے جد و جہد جاری تھی۔ لیکن گذشتہ جنگ نے اس تیز رفتاری
کو اور بھڑکا دیا۔ جمہوریت قائم ہونے پر دیرینہ رسوم و قیود یکدم
ٹوٹ گئیں۔ مدت کے دبے ہوئے خیالات دفعتاً نہایت

کے ساتھ ظاہر کئے جانے لگے۔ اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی ہر طرف سے کوششیں ہونے لگیں۔ ایسے حالات میں یہ قدرتی امر ہے کہ انقلابی کیفیت اعتدال سے بسا اوقات تجاوز کر جاتی اور ترکی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں

یہ ضرور نہیں کہ سیاسی انقلاب کے باعث ایک ملک کے تمدن میں بھی کایا پلٹ ہو جائے لیکن اگر اس قوم کی ذہنیت میں رفتہ رفتہ تبدیلی ہوتی رہی ہے تو سیاسی معاشرتی تبدل کا توام ہونا ناگزیر ہے۔ فرانسیسی انقلاب کی یہی اصلیت تھی۔ اور ترکی میں بھی معاشرتی انقلاب اسی بنا پر ظاہر ہو رہا ہے۔ اس قدر سرعت کے ساتھ کہ جیسا ترکی میں ہوا معاشرتی انقلاب شاید ہی کبھی وقوع میں آیا ہو مصطفےٰ کمال اور اس کے رفیقوں کی ذہنیت انقلابی خیالات سے بھری ہوئی تھی اور وہ ہر دیرینہ غیر قومی رسم کو مٹانے کے لئے کمر بستہ و تیار تھے اسلطان اور سلطانیت کا خاتمہ ہوا ہی تھا کہ صدیوں کی خلافت کو بھی یک لخت مٹا دیا۔ قدیم مدرسے اور مذہبی

درسگاہوں کا نام ونشان تک جاتا رہا اور ان کے کثیر اوقاف کو وزیر مالیہ کے سپرد کر دیا گیا + درویشوں کی خانقاہوں کا بھی یہی حشر ہوا اور ان کی ملکیت حکومت نے ضبط کر لی + بیرونی مشنری جماعتوں کا کام بھی بند کر دیا گیا + عیسائی ملت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی گذشتہ مراعات منسوخ کر دیئے گئے + مستورات بے پردہ نظر آنے لگیں اور ریل وغیرہ میں ان کے لئے مخصوص نشست گاہوں کا انتظام بھی ترک کر دیا گیا" + کلاہ لالہ رنگ" جو ترکی ٹوپی کے نام سے مشہور ہو کر ترکوں کے لئے مخصوص ہو چکی تھی ملک سے جلا وطن کر دی گئی اور اس کے ساتھ ہی قدیمی سلام کا طریقہ بھی ختم ہو گیا + ترکی ٹوپی کو گذشتہ قومی انحطاط کی یادگار سمجھ کر ہمیشہ کے لئے خیر باد کہدیا گیا ہے۔ اور اس کی جگہ اب مغربی ہیٹ نے لے لی ہے + ترکی ٹوپی کے استعمال کو ۱۹۲۵ء کے موسم گرما میں قانوناً ممنوع کر دیا گیا اور جب ہی سے ہیٹ کو رواج دیا گیا + سر ٹیلفورڈ واہ نے جو ترکی میں برطانی قونصل تھا اپنی کتاب" ترکی دیروز و امروز و فردا" میں

تحریر کیا ہے کہ جب یہ قانون نافذ ہوا تو وہ رخصت پر لندن
میں تھا۔ ایک دن اس کو ایک ہیٹ کے کارخانہ والے نے
بتایا کہ قسطنطنیہ سے تین ہزار ہیٹ کی مانگ آئی ہے + اسوقت
سر ٹیلیفورو اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر رہا۔ لیکن جب رخصت
ختم ہونے پر واپس ترکی گیا تو اس نے دیکھا کہ ترکی ٹوپی ملک
سے معدوم ہو چکی ہے + ہیٹ کو ترقی یافتہ اقوام کے لباس
کا جزو سمجھ کر ترجیح دیجاتی ہے اس کے اختیار کرنے سے یہی مدعا
ہے کہ ترکوں کا بھی شمار ترقی یافتہ اقوام میں ہو۔ روزمرہ گفتگو
کے عربی فارسی الفاظ اور فقرے متروک کر دیئے گئے ہیں +
حضرت رسالتمآب (روحی فداہ) کے خرقہ اور شمشیر کو آثار قدیمہ
کی نمائش گاہ کے سپرد کر دیا گیا ہے + اور سلاطین کے محلات کو قومی
تفریح گاہیں بنا دیا گیا ہے + جمعہ کے بجائے یکشنبہ چھٹی کا دن
مقرر کیا گیا ہے مہینوں اور تاریخوں کا شمار بھی مغربی طریقہ پر ہونے
لگا ہے + مذہبی تیوہار کی چھٹیوں میں بھی ردوبدل کر دیا گیا ہے +
الغرض پرانی رسموں سے وہ تنفر ظاہر کیا گیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے

ترکی کی دنیا ہی بدل گئی + ہر وہ شئی جو گذشتہ عہد کی یادگار بن سکتی تھی یا جس کو پرانے زمانے سے مناسبت ہو سکتی تھی آیندہ کے لئے محو ہو گئی ہے +

قومی زندگی کے لئے ضرورت تھی کہ قدیم شکستہ آثار کی جگہ نئی تعمیر اٹھائی جاتی مصطفے کمال اور اس کے رفیق اس طرف بہی جلد متوجہ ہوئے + ان کی آنکھوں کے سامنے مغربی معاشرت اور تمدن کا خاکہ کھنچا ہوا تھا اور وہ اسی کے مطابق اپنی تعمیر اٹھانا چاہتے تھے + سب سے پہلے وہ صنف نازک کی بہبودی کے لئے کوشاں ہوئے لیکن اس شاہراہ پر انہوں نے اس قدر تیزی سے گام فرمائی کی کہ جلد ہی اعتدال سے تجاوز کر گئے + شراب و منشیات کی خرید و فروخت کو امریکہ کے مانند ممنوع قرار دیا لیکن ایک سال کے تجربہ کے بعد اس ممانعت کو منسوخ کر دیا گیا + انفرادی سرمایہ داری کی بجائے حکومت کی جانب سے بڑے بڑے کارخانہ جات کھل گئے اور صنعتی درسگاہیں بھی قائم کی گئیں + بیرونی مالی امداد کو قطعی طور پر بند کر دیا گیا اور اپنے ہی تھوڑے

بہت سرمایہ سے شروعات کی گئی۔ لیکن جمہوریت نے سب سے زیادہ کوشش ملک کی تعلیمی حالت سدھارنے میں کی۔

ایک قوم کی تعلیمی حالت سے اس کی تمدنی اور معاشرتی نشو ونما کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تعلیم کہاں تک عام ہو چکی ہے کس طرح کا نصاب رائج ہے اور حکومت کی جانب سے ملک میں تعلیم پھیلانے کے لئے کیا کیا ذرائع اختیار کئے جا رہے ہیں؟ ترکی کی تعلیم کی حالت کا بھی انہیں سوالات کی مدد سے تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ ترکی میں مدتوں تک پرانے مشرقی اور جدید مغربی نصاب ایک ہی وقت میں جاری رہے ہیں۔ مذہبی درسگاہوں میں بچوں کو قرآن پاک اور عربی زبان کی دیگر مذہبی کتابوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ مدارس عموماً مساجد سے تعلق رکھتے تھے اور بیشتر ترکی بچے انہیں درسگاہوں میں تعلیم پاتے تھے۔ اس طرح غیر مسلم طلبار کی تعلیم ان کی مخصوص ملت کی نگرانی میں ہوا کرتی تھی۔ اعلیٰ مذہبی تعلیم کے لئے اسلامی مدارس قائم تھے اور عیسائیوں کی بھی تعلیم گاہیں موجود تھیں۔ غیر مذہبی تعلیم کے لئے ملتوں کے مدارس

جداگانہ تھے اور حکومت کی جانب سے بھی مغربی طرز کے ثانوی مدارس اور کالج کھلے ہوئے تھے جن میں علاوہ مسلم طلبا کے غیر مسلم بھی داخل ہو سکتے تھے + ان موخر الذکر درسگاہوں میں عموماً تعلیم کا معیار بہت اعلیٰ تھا۔ ازیں جملہ "گلاتا سرائے لائسی" قانونی اور طبی کالج قسطنطنیہ بہت مشہور تھے + لیکن یہ اچھے مدارس چند ہی تھے۔ اس لئے بیرونی اقوام نے اپنی زیر نگرانی ثانویہ مدارس اور کالج کھول دیئے تھے جن میں تعلیم بالکل قومی طرز پر ہوتی تھی اور بہت سے ترک طلبا، ان میں بڑی خوشی کے ساتھ شریک ہوتے تھے + اگرچہ حکومت ان درسگاہوں کو سیاسی حیثیت سے مشتبہ سمجھتی تھی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان مدارس نے ترکوں کے لئے مغربی علوم و فنون کا دروازہ کھول رکھا تھا + یہ مختلف النوع تعلیمی نظام ترکی میں کم و بیش گزشتہ ایک صدی سے رائج تھا اور ترکی معاشرت اور خیالات رفتہ رفتہ ان مدارس سے متاثر ہو رہے تھے + جمہوریت کے قائم ہونے پر غیر مذہبی نصاب کے لئے زور دیا جانے لگا چنانچہ یوسف بے وکیل تعلیم

نے ۱۹۲۴ء میں مذہبی مدارس کو بند کرا دیا۔ اور ان کے اوقات کو دیگر ضروری کاموں کے لئے مخصوص کر دیا + عام خیال تھا کہ حکومت کے اس فعل پر ہر طرف سے شورش شروع ہو جائے گی لیکن علماء ترک خاموش رہے اور کوئی مخالفت نہ کی گئی + جبریہ تعلیم تمام ملک کے لئے قانوناً لازم کر دی گئی اور ضبط شدہ اوقاف کی مدد سے ہر جگہ تحتانیہ مدارس اس مقصد کے لئے کھول دیئے گئے + سات سال سے زیادہ عمر کے بچوں کے لئے تعلیم فرض ہے اور ان تحتانیہ مدارس کا نصاب ترکی زبان اور ادب، تاریخ و جغرافیہ اور ریاضی پر مشتمل ہو + تعلیمی شعبہ محکمہ تعلیم کے ماتحت ہے اور ہر قسم کے مدارس اسی محکمہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کی نگرانی وکیل (یعنی وزیر) تعلیم کے سپرد ہے + نارمل اسکولوں میں طلباء کا تمام خرچ حتیٰ کہ لباس و خوراک تک حکومت کی جانب سے دیا جاتا ہے + اسی طرح یونیورسٹی میں بھی طلباء کی ایک کثیر تعداد سرکاری وظیفہ سے مستفید ہوتی ہے + تعلیم ختم کرنے پر بطور معاوضہ ان طلباء کو چند سال حکومت کی نوکری کرنی پڑتی ہے +

ترکی کے اعلیٰ مدارس کا وہی نمونہ ہو جوکہ بیرونی اقوام کے مدارس کا ہو اور اس میں تعلیم اعلیٰ معیار تک دیجاتی ہو۔ ان مدارس میں تعلیم کے لئے باقاعدہ نمائش گاہیں اور علیحدہ علیحدہ جماعتوں کے لئے مختلف کمرے بنے ہوئے ہیں۔ زراعتی اسکول ملک میں ہر جگہ کھولے گئے ہیں۔ تجارتی اور صنعتی اسکول بڑے بڑے مقاموں پر جاری کئے گئے ہیں۔ "گلاتا سرائے" جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہو ترکی کی ایک مشہور درسگاہ ہے۔ جوکہ جنگ کریمیا ۱۸۵۶ء کے بعد فرانسیسی مدد سے قائم کی گئی تھی اس میں اب تک متعدد معلم فرانسیسی ہیں۔ اس مدرسہ کی سند فرانس میں اسی طبقہ کے مدارس کے ڈپلوما کے برابر تصور کی جاتی ہو اور یہ "سرائے" ترکی کے دیگر ثانوی مدارس کے لئے بطور نمونہ پیش ہوتی ہو استنبول میں ترکی کی واحد یونیورسٹی ۱۹۰۰ء میں قائم کی گئی تھی۔ موجودہ طبی اور قانونی کالج اسی جامعہ سے متعلق ہیں اس میں مستورات بھی مرد طلباء کے ساتھ تعلیم پاسکتی ہیں چنانچہ اب وہ ہر سال زیادہ تعداد میں داخل ہو رہی ہیں اور مختلف شعبوں۔ مثلاً

طب۔ قانون۔ دینیات فلسفہ اور فن مدرسی میں دسترس حاصل کر رہی ہیں۔ باوجود اقتصادی مشکلات کے یہ یونیورسٹی قابل ستائش کام کر رہی ہے اور تمام ملک کا تعلیمی مرکز سمجھی جاتی ہے۔

ترک نوجوان طبقہ میں یونیورسٹی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور اپنے ملک ہی میں آسانیاں بہم پاکر ان کے شوق میں روز بروز اور بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ بہت سے طلبا جو کمزور مالی حالت کی وجہ سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے وہ بھی یونیورسٹی میں داخل ہونے کے خواہاں رہتے ہیں اور ان کے اس وفور شوق کی کیفیت حسب ذیل خط سے جو ایک ترک خاتون نے قسطنطنیہ یونیورسٹی سے لکھا تھا ظاہر ہوتی ہے:۔

"ترک طلبا میں سے بیشتر اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے خود کماتے ہیں۔ ترک طلبا اور غیر ممالک کے طلبا میں بڑا فرق ان کے خیالات کا ہے جو وہ خود روزی کمانے کے متعلق رکھتے ہیں۔ بعض کاموں کو وہ ذلیل سمجھتے ہیں نیز ہاتھ سے کام کرنے کو حقیر جانتے ہیں اس میں ان کا قصور نہیں کیونکہ ان کے یہاں یہ رواج نہیں کہ تعلیم

یافتہ شخص جوتوں پر پالش یا بار برداری وغیرہ کرے + لیکن ایک نوجوان ترک جو خود اپنے لیئے نہیں کما سکتا یونیورسٹی میں داخل نہ ہوگا وہ بجائے اس کے کہ یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کا خواہاں ہو۔ اپنا تمام وقت کسی پیشہ میں ماہر بننے کے لیئے صرف کردیگا + جو طلباء دارالعلوم میں داخل ہوتے ہیں وہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیئے خود کماتے ہیں کیونکہ ان میں سے متعدد شادی شدہ ہوتے ہیں + اور اکثر حکومت کے مختلف محکمہ جات میں کلرکی اور نقل نویسی کا کام کرتے ہیں قانونی طلباء عدالتی کاموں سے کچھ کما لیتے ہیں + یونیورسٹی کے چند ہی طلباء ایسے ہیں جو کام نہیں کرتے + عام طور پر طلباء تعلیم کو جاری رکھنا پسند کرتے ہیں اور اس سال (۱۹۲۴ء) میں طلباء کی تعداد گذشتہ سالوں سے بہت بڑھکر ہے"۔ (برات اکرم خاتون) مرقومہ اکتوبر ۱۹۲۴ء

جامعہ کے قیام کے لیئے عمارت ناکافی تھی لیکن جمہوری حکومت نے استنبول میں فوجی محکمہ کی عمارت کو یونیورسٹی کے سپرد کردیا ہے۔ اگرچہ حکومت کی جانب سے تعلیم پر ہر ممکن ذرائع سے خرچ کیا جارہا ہے لیکن تاہم اعلیٰ تعلیم مالی کمزوری کے باعث حسب ضرورت عام

نہیں ہو سکی۔ غالباً اسی وجہ سے اب تک بیرونی مدارس سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا حالانکہ ہر دیگر بیرونی مراعات کا فوراً ہی خاتمہ کر دیا گیا تھا۔

ترکی جمہوریہ کے حدود میں غیر اقوام مثلاً امریکہ۔ فرانس جرمنی اور انگلستان کے متعدد مدارس موجود ہیں۔ ابتدا میں ان مدارس میں انہیں ممالک کے طلبا تعلیم پاتے تھے۔ کیونکہ سلطان عبدالحمید کے عہد میں جو ۱۹۰۸ء تک قائم رہا مسلم طلبا کو انئیں داخل ہونے کی ممانعت تھی۔ جنگ عظیم سے قبل مشرق قریب میں فرانسیسی مدارس کی تعداد سب سے زیادہ تھی کیونکہ اس علاقہ میں فرانسیسی تمدن کا اثر بہت زیادہ تھا۔ ہر تعلیم یافتہ ترک فرانسیسی زبان میں اسی قدر مہارت رکھتا تھا جتنی کہ اپنی مادری زبان میں۔ کئی ثانویہ مدارس بالکل فرانسیسی طرز پر قائم تھے چنانچہ آجکل ترکی میں سب سے زیادہ مروجہ غیر زبان فرانسیسی ہے اور اسی کے باعث ترکی اور فرانس میں ایک علمی تعلق ہو گیا ہے جو ۱۹۱۴ء تا ۱۹۲۳ء کے واقعات سے بھی زائل نہیں ہوا۔ مملکت عثمانیہ میں امریکہ کا اثر بھی

کافی نمایاں تھا + مشہور بیروت یونیورسٹی جو پہلے پروٹسٹنٹ سیریں کالج کہلاتا تھا امریکہ کی قائم کردہ ہے۔ زنانہ کالج قسطنطنیہ میں اور بین الاقوامی کالج سمرنا میں۔ امریکہ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے + اس کے علاوہ مشرق قریب میں جنگ سے قبل امریکہ کے ماہرین تعلیم مختلف درجوں کے پانچسو مدارس چلا رہے تھے جن میں پچیس ہزار سے زائد طلبا تعلیم پاتے تھے + ان میں بیشتر مدارس اب ترکی کی موجودہ حدود سے باہر ہیں + ان مدارس کا اثر ترکی رعایا پر بہت گہرا پڑ رہا تھا لیکن مراعات کی موجودگی میں سلطنت عثمانیہ ان کے نصاب میں دخل اندازی نہ کر سکتی تھی + چنانچہ ۱۹۱۴ء میں جیسے ہی مراعات کا پہلی مرتبہ خاتمہ ہوا حکومت نے فرانسیسی مدارس کو بند کر دیا جن کی وجہ سے فرانسیسی اثر وقتاً کم ہو گیا + عارضی صلح ۱۹۱۸ء کے بعد دول متحدہ نے جرمنی کے اسکولوں کا بھی خاتمہ کر دیا + امریکن مدارس بیشتر عیسائی تبلیغی جماعتوں کے ماتحت تھے اور چونکہ عیسائی ملتیں نیست و نابود ہو چکی تھیں اس لئے ان کی تعداد میں بھی نمایاں تخفیف ہو گئی تھی اور جو باقی رہ گئے

ان میں اب غیر مذہبی تعلیم دیجاتی ہے + اس میں شبہ نہیں کہ ان کالجوں
کی تعلیم سے ترکی کے ہر طبقہ کے باشندے مستفید ہوتے رہے
ہیں مثلاً انور پاشا نے اپنے بھتیجے کو سمرنا کے امریکن کالج میں داخل
کرادیا تھا اور اسی طرح عصمت پاشا نے اپنے بھائی کو قسطنطنیہ کے
کالج میں بھیجا تھا + لوزان کانفرنس میں ان مدارس کے متعلق دانستہ
کوئی تجویز پیش نہیں کی گئی تھی بلکہ عصمت پاشا نے ایک علیحدہ تقریر
کے ذریعہ دول متحدہ کے نمایندوں کو یقین دلایا تھا کہ ان مدارس
کے حقوق برقرار رکھے جائیں گے + تاہم ان اسکولوں کی نگرانی
اب جمہوریہ ترکی خود کرتی ہے + تعلیم اور امتحانات کا ترکی افسران
معائنہ کرسکتے ہیں۔ ترکی مضامین نصاب میں اب لازمی طور پر
داخل کردیئے گئے ہیں۔ ترک معلم ان مدارس میں حکومت کی جانب
سے مقرر کیئے گئے ہیں + اور اگرچہ کبھی کبھی ان کے اور دیگر معلموں
کے تعلقات میں ناگواری پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن بالعموم وہ یک جہتی
کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں + جمہوری حکومت ان
مدارس کے لیئے بشرطیکہ ان میں مخصوص مذہبی تعلیم نہ دیجائے اور

حکومت کے خلاف مفسدانہ خیالات نہ پھیلائے جائیں عام طور پر ہر قسم کی رواداری جائز رکھی ہے + لیکن اگر کہیں دانستہ یا غیرارادی طور پر اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو حکومت سختی سے تادیب کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے +

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ نئی حکومت تعلیم پھیلانے کیلئے انتہائی جد و جہد کر رہی ہے اور اس کوشش میں کافی کامیاب نظر آتی ہے + مذہب اور سیاست کو علیحدہ علیحدہ کر دینے کی وجہ سے تمام مدارس میں ایک مشترکہ نصاب قائم ہو گیا ہے + اور اس سے مدعا طلبا کو متفق الخیال بنانا ہے + تعلیمی نشو و نما کے لئے مغربی یورپ اور امریکہ کے حالات کو بطور نمونہ پیش نظر رکھا جاتا ہے + اس سلسلہ میں خواتین کی بیداری بھی قابل ذکر ہے + کیونکہ ایک ملک کی معاشرتی ترقی کا اندازہ اس کے نسوانی طبقے ہی کی حالت سے بخوبی ہو سکتا ہے + عموماً مغربی اقوام ترکی پر معترض ہوا کرتی ہیں کہ ترکی میں طبقۂ نسوان کی حالت پست ہے + لیکن اس اعتراض کی حقیقت بیشتر معترضین کی کور باطنی اور ناواقفیت پر مبنی ہے +

علاوہ ازیں ہر وہ معاشرت جو موجودہ مغربی روش سے مختلف ہے اسے اہل مغرب پست اور حقیر ہی بتلایا کرتے ہیں + شاید اہل مغرب کو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ اسلامی شریعت کے مطابق عورت کو شخصی و ذاتی ملکیت پر تیرہ سو سال سے وہ حقوق حاصل ہیں کہ جو متمدن مغربی اقوام کی ترقی یافتہ خاتون کو ابھی کل تک حاصل نہ تھے + مزید یہ آں آج مغربی معاشرت کے متعدد رواج پر اہل مغرب خود ہی نکتہ چیں ہو رہے ہیں + اگرچہ ان نکتہ چینیوں کی مخالفت فی الحال مغربی نقار خانوں میں طوطی کی آواز سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی لیکن اس کا اثر بالآخر ضرور نمایاں ہوگا + چست اور کوتاہ لباسی کے خلاف آئے دن اخبارات میں چرچا رہتا ہے + اور اگرچہ باعصمت عورت کا حسن اسکا عزیز تریں سرمایہ ہے لیکن آج کل مغربی بازار میں مقابلہ کے لئے حسن خود ہی آرائش جمال کرکے دیدار عام کے لئے بے حجابانہ نظر آتا ہے۔ اور اس امید پر کہ مقابلہ حسن میں سرتاج حسینان کا خطاب اور انعام پا جائے + اٹلی کے پوپ نے

اس کی مخالفت کی۔ لیکن مہذب اقوام نے مقدس مذہبی پیشوا کی بات کو ان سنی کر دیا + آج ہزاروں بلکہ لاکھوں متمدن خواتین خانہ داری کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے تیار نہیں جس کے باعث خانگی زندگی کا شیرازہ منتشر ہوا جا رہا ہے لیکن یہاں یہ مقصود نہیں کہ مغربی معاشرت کے نقائص پیش کئے جائیں۔ اصل مدعا ترکی کے طبقۂ نسواں کی بیداری کا اظہار کرنا ہے + جہاں مغربی معاشرت میں کچھ نقائص موجود ہیں وہاں اس میں بہت سے محاسن بھی ہیں اور ان کا اعتراف نہ کرنا بیجا ہوگا + نسوانی تعلیم اور نسوانی آزادی مغربی معاشرت کے دو بڑے جزو ہیں + ترکی میں بھی نسوانی بیداری انہیں دو مقاصد کو پیش نظر رکھ کر وقوع میں آئی ہے + لیکن توقع کے خلاف ترکی نے مغربی معاشرت کی کورانہ تقلید کی۔ اور اگرچہ امید تو یہ تھی کہ ان خصوصیات سے جن پر اہل مغرب خود معترض ہیں ترکی اجتناب کریگی لیکن ترکی معاشرت اب کم و بیش وہی ہے جو اہل مغرب کی ہے اور اس لئے دیار مغرب کے رہنے والوں کے نزدیک اب ترک بھی

متمدن اور مہذب کہلانے کے مستحق ہیں +

خواتین کو تعلیم دینا یا ان کو پس پردہ نہ ڈال رکھنا اور ان کے حقوق کا خیال رکھنا یقیناً نہایت مستحسن امور اور اسلامی شریعت کے مطابق ہیں + مردوں کی خود غرضی سے اکثر ممالک میں عورتوں کے یہ حقوق سلب ہو گئے تھے + لیکن اسلامی شرع اور شعار ہمیشہ حقوق نسواں کا حامی و معاون رہا + خواتین موجودہ زمانہ میں ہی نہیں بلکہ ہمیشہ سے مردوں کے دوش بدوش رہی ہیں + اسلام کا شروع کا زمانہ تھا کہ دمشق کا محاصرہ کیا گیا + ایک غزوہ میں اسلامی لشکر کا ایک بہادر سپاہی ضرارؓ ابن ازورؓ گرفتار ہو گیا اس کو رہائی دلانے کے لیے کمک روانہ کی گئی۔ موقع پر معلوم ہوا کہ اس کی بہن خولہ مردانہ لباس میں کمک کے ساتھ موجود ہے۔ اور برابر لڑ رہی ہے اور آخر کار اپنے بھائی کو رہا کرانے میں کامیاب ہوئی۔ اوائل غزوات اور حروب صلیبیہ کے دوران میں مستورات برابر میدان جنگ میں شریک ہوتی رہی تھیں + ترکی کے مضافات میں عورتیں ہمیشہ سے اپنے مردوں کو زراعت

اور کاشتکاری میں مدد دیتی رہی ہیں یعنی محض کارآمد ہونے کے لحاظ سے بھی وہ متمدن خواتین سے کبھی بھی پیچھے نہیں تھیں +
رہا کثرت ازدواج کا مسئلہ تو اس کو مغربی اقوام نے کبھی ٹھیک معنوں میں سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور ہمیشہ مکروہ تاویلات ہی پیش کرتی رہیں + کثرت ازدواج کا کبھی عام دستور نہیں رہا لیکن پھر بھی مغربی نکتہ چینیوں سے بچنے کے لیئے جمہوری حکومت نے مزید قانونی پابندیاں عائد کردی ہیں +

مغربی خیالات کا اثر ترکی عورتوں پر بھی پڑا اور انہوں نے بھی مردوں کی تقلید میں مغربی روش کو پیش نظر رکھ کر اپنی حالت کو تبدیل کرنا شروع کیا + سب سے پہلے تعلیم پر زور دیا گیا اور لڑکیاں مدارس میں عام طور پر داخل ہونے لگیں + عورتوں نے بحیثیت مصنف نام پیدا کیا اور مختلف پیشوں میں داخل ہونے کے لیئے از حد کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ڈاکٹری - اور قانونی اور دیگر کالجوں میں ان کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے + مغربی لباس نے مردوں سے گذر کر عورتوں کو بھی اپنا

گرویدہ بنا لیا + خواتین یورپ کی مختلف زبانوں میں بڑی
دلچسپی سے تعلیم حاصل کر رہی ہیں + لیکن یہ سب کچھ صرف
موجودہ جدوجہد کا نتیجہ نہیں بلکہ نوجوان ترکوں کے زمانۂ
انقلاب (۱۹۰۸ء تا ۱۹۰۹ء) سے اس کا ظہور ہو رہا ہے +
جنگ کے دوران میں خاصکر جنگ بلقان (۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۳ء)
اور جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) میں ترکی مستورات نے
قومی ذمہ داری کا پورا پورا حق ادا کیا + تیمارداری اور
ہسپتال کا کام دیگر مغربی خواتین کے مانند کرتی رہیں- ہلال احمر
کے سلسلہ میں انہوں نے بیش بہا خدمات سر انجام دیں +
مردوں کی جگہ دفاتر میں بھی کام کرتی رہیں میدان جنگ تک
میں شریک ہوئیں اور آج رفاہ عامہ کے کاموں میں خواتین
مردوں کے دوش بدوش چل رہی ہیں + الغرض اعلیٰ اور متوسط
طبقوں میں مستورات نے اپنی قابلیت کے جوہر دکھا کر اپنی
آزادی مکمل طور پر حاصل کر لی ہے + ادنیٰ طبقہ اور مضافات
میں ترکی مستورات ہمیشہ سے مردوں کی مانند شریک کار رہی

ہیں۔ اور ان کی وہ حالت اب تک برقرار ہے +
ترکی میں تعلیم نسواں کو از حد مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ غیر ملکی مدارس آج کل بھرے رہتے ہیں۔ قسطنطنیہ یونیورسٹی میں بھی خواتین کو داخل کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح سے لڑکوں کے ساتھ "ہم تعلیمی" کا اصول ترکی میں..... بھی مان لیا گیا ہے + مستورات مدرسی۔ طبی اور قانونی کالجوں میں متواتر شریک ہو رہی ہیں + اپنے سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لئے وہ لکچر دیتی ہیں اور مضامین لکھتی + اسی مقصد کے لئے حال میں "انجمن تحفظ حقوق نسواں" قائم کی گئی ہے +
خالدہ خانم سب سے پہلی خاتون ہے جس نے یونیورسٹی ڈگری حاصل کی + وہ مصطفےٰ کمال کی ناظم خصوصی بھی رہ چکی ہے + اس کی معجز بیانی اور ادبی تحریرات نے ملک پر گہرا اثر کیا اور نسوانی تحریک کو اور بھی فروغ دیا +
معاشرتی حالت میں مغرب کا چربہ اتارا جا رہا ہے + نقاب اور چارشف معدوم ہو چکے ہیں + تھیٹر اور دیگر تفریح گاہوں

میں مستورات اب مردوں کے ہمراہ بیٹھتی ہیں اور ترک مردوں کیساتھ عام منظر میں ناچنا بھی روا رکھا جاتا ہے۔ ہوٹلوں اور ٹریم کاروں اور تفریح گاہوں میں عورتوں کے لیئے تخصیص نشست کا انتظام باقی نہیں رہا۔ مغربی اثر موسیقی میں بھی نمودار ہو رہا ہے۔ گانے میں آواز کے ٹکڑے اسی اصول پر کئے جاتے ہیں کہ مغربی باجوں پر مغربی طرز سے ادا ہو سکیں۔ یہی اثر دیگر فنون لطیفہ میں بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ لیکن فنون لطیفہ میں بھی قومی جوش کا اثر نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر ایک گراموفون رکارڈ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مغنیہ کا نام فاطمہ مقبولی خانم ہے اور رکارڈ کے دونوں گانے قومی احساس سے لبریز ہیں۔ ایک نغمہ چناقلعہ یعنی گیلی پولی کی لڑائی کا قومی ترانہ ہے اور دوسرا "کمال پاشا" کے متعلق ہے۔ محض لہجہ اور آواز سے ہی وہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ خون کی حرکت میں تیزی محسوس ہونے لگتی ہے اور اس کے معنی سمجھنے پر تو عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ان گانوں سے مغربی موسیقی کا

کا تتبع بھی صاف ظاہر ہوتا ہے +

اوپر جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے وہ بالکل واقعات پر مبنی ہے اور اس میں کسی قسم کا مبالغہ شامل نہیں۔ تاہم اس سے پوری اور اصلی حالت کا ٹھیک اندازہ نہیں ہو سکتا + چونکہ یہ تبدل غیر متوقع اور دفعتاً وقوع میں آیا ہے اس لئے تمام دنیا اور خاصکر ممالک اسلامی حیرت زدہ ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک تمام علاقہ جات کی یہ حالت نہیں ہے + ملک کے اندرونی حصوں میں جہاں ابھی تک علم کی روشنی نہیں پہونچی وہاں کے حالات مختلف ہیں + اگرچہ یہ توقع ہو سکتی ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد تمام ملک میں یہی خیالات عام ہو جائیں گے اور یہی معاشرت قائم ہو جائے گی + ترکوں کو عام طور پر آج کل لامذہب سمجھا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ وہ صراط مستقیم سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ گذشتہ انقلاب کی چند خصوصیات جنکا ذکر ہو چکا ہے ایسی ہیں کہ جن کی وجہ سے ترکوں پر یہ الزام عائد کیا جا سکتا ہے لیکن اس سلسلہ میں

حص رائے زنی کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا بلکہ واقعات پر ہی غور کرنا بہتر ہے قومی معاہدہ کی دفعہ (۲) حسب ذیل الفاظ میں ہے" مملکت ترکی کا مذہب اسلام ہے" علاوہ ازیں۔ابھی حال میں ایک ترکی اخبار" المفید" کے مدیر استنا ذآمین آفندی نے مصطفٰے کمال سے اپنی ملاقات کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غازی پاشا نے میرے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ" ہم اسلام کے سچے پرستار ہیں اور ہمارے قلب میں اسلامی تعلیمات کا احترام جاگزیں ہے اور اس کے ثبوت کے لئے صرف یہ کافی ہو کہ ہمپر اعتراض کرنے والے اسلام کی خاطر کبھی میدان میں نہیں نکلے اور ہم نے اسلام کی عزت کے لئے مسلسل جہاد کیا ہے۔اب اگر اسلام کے لئے کوئی نازک وقت آئے تو یہ اعتراض کرنیوالے مع اپنے جبروت کے اپنے حجروں میں جا چھپیں گے اور ہم تیغوں کے سایہ میں اسلام کی حمایت کریں گے + اب میں یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری جماعت اسلام پر فدا ہو اور اسلام ہماری عزیز ترین متاع ہے

لیکن وہ اسلام نہیں جو ملاؤں کے پاس ہے بلکہ وہ اسلام جو قرآن کریم میں ہے۔ ان یہودی صفت ملاؤں کے پاس چند ظاہری مراسم ہیں چند ریاکاری کے مظاہرے اور شکم پروری کے سوائے اور کچھ نہیں اور ہمارے نزدیک اسلام نام ہے اپنے تمام قویٰ کے ساتھ رب العالمین کے حضور میں جھک جانے کا اور اس کے احکام پر عمل کرنے کا + اسلام کسی خاص لباس کا نام نہیں۔ اسلام نام ہے صرف خدا کی آواز پر لبیک کہنے اور اپنی حرکت کو اس کی رضا و منشاء کے مطابق بنانے کا + ہم مجلس وطنی کے تمام ارکان قرآن پاک کے احکام سے واقف ہیں اور ہم فرائض کے پابند ہیں" یہ صدر جمہوریہ کے الفاظ ہیں ان پر یقین کیا جائے یا نہیں بہر حال ہر شخص کو رائے قائم کرنیکا حق حاصل ہے + لیکن کچھ زمانہ گذرنے پر حالات کا تجزیہ مناسب طور پر ہو سکے گا اور تب ہی ٹھیک اندازہ ہو سکے گا کہ مغربی تقلید کس حد تک جاری رہے گی اور کس حد تک ترک مسلمان اس کو برداشت کرسکیں گے + جو شعر کتاب کے شروع میں درج

ہے اسی پر اس کو ختم کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے او
ترکی کے مستقبل کے لئے وہی بہترین پیشین گوئی ہوسکت
ہے +

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائیگی